خدا بخش لائبریری جرنل

شمارہ: ۱۹۵—۱۹۶ جنوری — جون ۲۰۱۹

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

ایڈیٹر
ڈاکٹر شائستہ بیدار
ڈائریکٹر، خدابخش لائبریری

رجسٹریشن نمبر : ۳۳۴۲۴/۷۷
شمارہ : ۱۹۵-۱۹۶

زرسالانہ

افراد	:	۴۰۰/-
ادارہ	:	۵۰۰/-
غیر ممالک		
افراد	:	۳۰ ڈالر
ادارہ	:	۶۰ ڈالر

مقالہ نگاروں کے افکار و آراء سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

محمد جاوید اشرف نے پاکیزہ آفسیٹ، شاہ گنج، پٹنہ میں چھپوا کر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا۔

فہرست

اداریہ	پانچ-چھ
رشید احمد صدیقی کے خطوط، بھٹناگر صاحب کے نام، مرتبۂ : ڈاکٹر ذکیہ جیلانی	۱
فہمیدہ ریاض، از ڈاکٹر غلام شبیر رانا، ڈاکٹر محمد اسلام خاں، ڈاکٹر سعدیہ اقبال	۱۰۳
غبار خاطر کا مقدمہ، از پروفیسر محمد اجمل خاں (جسے مولانا آزاد تکلفاً اپنا نہیں کہتے) (ش)	۱۲۰
معاصر اردو ادب کے گونگے خطیب، از ڈاکٹر افتخار امام صدیقی [جرعات رسالہ شاعر سے]	۱۴۳
کیفی اعظمی خود اپنی تحریر میں (غیر مطبوعہ خط اور کیفی کا اپنا کیا ہوا انتخاب) (پیشکش: ادارہ)	۱۴۵
البدور البازغہ کا مطالعہ: ایک زاویۂ نظر، از ڈاکٹر عبدالباری	۱۵۷
اشاریوں کا اشاریہ، از ڈاکٹر سید مسعود حسن	۱۶۲
تازہ کتب و رسائل: تعارف (ادارہ)	۱۹۱

انگریزی۔ ہندی

آرام شاہ: عہد سلطنت کا ایک باب، از ڈاکٹر ریحانہ بیگم (انگریزی)	۱-۱۰
مولانا آزاد کیوں بڑے تھے؟ (ہندی)	۱-۴۶

مقالہ نگار

☆ ڈاکٹر افتخار امام صدیقی، ایڈیٹر ماہنامہ شاعر، ممبئی

☆ ڈاکٹر ذکیہ جیلانی، سابقاً منٹو سرکل، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

☆ ڈاکٹر ریحانہ بیگم، امیر ہاؤس، مکان نمبر ۶۰/۱۵۷، دیوان دیارام، ریتی چوک، گورکھپور

☆ ڈاکٹر سعدیہ اقبال، راشٹر سہارا

☆ ڈاکٹر سید مسعود حسن، خدا بخش لائبریری پٹنہ

☆ ڈاکٹر عبدالباری، سابق صدر، شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

☆ ڈاکٹر غلام شبیر رانا، مصطفیٰ آباد، جھنگ سٹی، پاکستان

☆ ڈاکٹر محمد اسلام خاں، راشٹریہ سہارا

اداریہ

خدابخش لائبریری ۲۰۱۴ء یا اس سے کچھ قبل ہی سے کچھ ایسے ناگزیر حالات سے گذری جس سے اپریل ۲۰۱۹ء سے پہلے نکل نہ پائی۔ لائبریری کا ایک سہ ماہی جرنل جو مرحوم قاضی عبدالودود صاحب کی رہنمائی میں ۱۹۷۷ء سے نکلنا شروع ہوا، ۲۰۱۴ء میں پچھلی سیریز کا گویا آخری شمارہ نکلا، جو پورے ایک سال کے چار شماروں کی جگہ سال میں ایک شمارہ کے حساب سے شائع ہوا، اس کے بعد ۲۰۱۵ء، ۲۰۱۶ء، ۲۰۱۷ء، ۲۰۱۸ء کے دوران جو تعطل رہا، ایک سال کے ایک شمارے کے حساب سے تو ہو ہی جاتا؛ سو اب ہو گیا، اور ۲۰۱۴ء کی طرح ان چار برسوں کا بھی بھرت پورا ہو گیا، یعنی ایک سال کے ایک شمارہ ہی کا حساب بن پایا، مگر تسلسل رکھنے کے لئے نمبروں کو مسلسل کر دیا گیا، آگے پھر یہ ہوا کہ ۲۰۱۹ء میں سال میں ایک شمارے کی اوسط بڑھا کے سال میں دو شماروں تک لے آیا گیا ہے، یعنی جنوری تا جون ۲۰۱۹ء-اور- جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء۔

۲۰۱۵ تا ۲۰۱۹ء کے 'مقروض' شماروں میں بیشتر تو نئی تحریریں ہیں، مگر ایک آدھ وہ

بھی جو ہماری قدیم میراث میں شامل تھیں، اوران کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ انھیں ازسرِ نو شائع کیا جائے۔

ان برسوں کے قرضے کی ادائی میں ہمیں عبدالرحمٰن صاحب (ساکن ضلع ارریہ سابق ضلع پورنیہ) کا تعاون حاصل رہا، اس کے لئے دلی شکریہ۔ ڈاکٹر محمد ذاکر حسین صاحب نے سال ۲۰۱۹ء میں اس سیکشن کا چارج سنبھالا، ان سے بھی تعاون ملا۔ چند مضامین کا پروف بھی اچھے طور سے پڑھا، اور مجموعی ہیئت کو سنوارنے میں بھی (فہرست وغیرہ) انھوں نے مدد دی، اس کے لئے ان کا شکریہ۔ سب سے اہم شکرگزاری پرانے خریداروں کی ہم پر واجب ہے، اور نئے خریداروں کی شکرگزاری بھی۔ مزید شکرگزاری ان رسائل کی بھی جو خدابخش لائبریری کے ذخیرے کو بھرپور بنانے کے لئے اپنے مجلّات بھیجتے رہے ہیں۔ ان رسائل میں جو لائبریری کو موصول ہوتے رہے ہیں، اکثر کو ہم نے اپنی مستقل مبادلہ فہرست میں رکھا ہے، مبادلے والے رسائل کے مدیران کرام پر ہمارے جرنل کی رسید واجب ہے جب یہ تازہ شمارے ان تک پہنچ جائیں۔

ہمارا جرنل ان مضمون نگاروں کو پہنچنا ضروری ہے، اور متوقع مضمون نگاروں کو بھی، جو خدابخش لائبریری اور اس کے جرنل سے تعلق بنائے رکھنا پسند کرتے ہیں۔

(ش)

رشید صاحب (رشید احمد صدیقی)

کے خطوط

بھٹناگر صاحب (شیام کرشن بھٹناگر) کے نام

مرتبہ

ڈاکٹر ذکیہ جیلانی

(علی گڑھ)

پیش گفتار

بلند شہر کے کایستھوں کے مشہور بھٹنا گر خاندان سے دو بڑے نام وابستہ ہوئے، ایک سینئر بھٹنا گر ڈاکٹر شانتی سروپ، اور دوسرے ہمارے شیام کرشن بھٹنا گر۔ اوپر جا کے شاید دونوں کا رشتہ مرزا غالب کے عزیز شاگرد ہرگوپال تفتہ سے مل جاتا ہے۔ شیام کرشن کا شاعری سے کوئی ربط نہیں تھا، شاعری کی جگہ البتہ **علی گڑھ** نے لے لی تھی جو ان کے بقول ان کی رگوں میں دوڑتا پھرتا خون بن گیا تھا، جو ان کے لئے تو آخر کو ان کی مانومینٹل کتاب ''ایم اے او کالج کی تاریخ'' (History of MAO College) کی صورت میں سامنے آ کے آنکھ سے ٹپکا ہوا لہو بن گئی۔

بھٹنا گر صاحب کی ایک یادگار کتاب جس کا نام اوپر مذکور ہوا، جو رشید صاحب سے خط و کتابت کا وسیلہ بنی، بھٹنا گر صاحب نے از راہ کرم یہ خطوط مجھے عنایت کر دیئے تھے، اور جو میں چالیس پچاس برس سے اپنے دل کے قرین رکھ کر ایک قیمتی امانت ہی نہیں، بے بہا خزانہ سمجھ کر حفاظت کرتی رہی ہوں، اور اب رشید دوستوں، علی گڑھ دوستوں اور ادب دوستوں کو بطور سوغات پیش کرنے کے لئے آمادہ ہو گئی ہوں۔

اوپر بھٹنا گر صاحب کی ایک یادگار کا ذکر ہوا، اتنی ہی عزیز یادگار ان کی بیٹی بھی ہیں (مسز منی مالا)۔ جب اس سوغات کو ادب دوستوں میں بانٹنے کے لئے میں آمادہ ہوئی تو میری خوشی میں وہ بھی برابر کی شریک ہوئیں۔ مالک سے ان کی عمر اور صحت کی درازی کے لئے دعا کرتی ہوں۔ بھٹنا گر صاحب کے نام رشید صاحب کے ان خطوط کی کہانی یہ ہے کہ مرحوم و مغفور سید حامد حسین جیلانی صاحب (میرے والد مرحوم) شیام کرشن بھٹنا گر صاحب کے بڑے عزیز دوست تھے، جب ہم لوگ ان سے چند سال قبل علی گڑھ آ بسے تھے اور جب ان کی ۱۹۵۹ء میں بطور امپلائمنٹ ایکسچینج آفیسر کے، علی گڑھ میں تعیناتی ہوئی، یونیورسٹی کے حدود ہی میں ان کا آفس بھی ہو گیا، یہ تار بنگلہ پر واقع تھا، جہاں سے رشید صاحب کا مکان قریب ہی تھا: اگرچہ

اس قربت سے دونوں کو ملنے ملانے میں کوئی خاص فائدہ نہ ہوا، ملنا ملانا خط و کتابت ہی کی شکل میں ہوتا رہا۔

معلوم ہوتا ہے علی گڑھ کے ابتدائی دنوں میں تو بھٹناگر صاحب، رشید صاحب کی ملاقات ادبی منزلت کے سبب ہوئی ہوگی، یا سرشانتی سروپ بھٹناگر کے واسطے سے جو بڑے سائنٹسٹ تو تھے ہی، اردو کے بھی بڑے آدمی تھے، اور پھر ہرگوپال تفتہ کے بھی تو کچھ ہوتے تھے، رشید صاحب کے لئے بس اتنا تعارف کا وسیلہ کافی تھا، وہ شیام کرشن بھٹناگر کو اپنے قریب سمجھنے لگے۔ پھر یہ ہوا کہ امپلائمنٹ ایکسچینج یا روزگار کا دفتر تو کون سی مصروفیت کا کام تھا، بھٹناگر صاحب جو محسوس کرتے تھے Ailgarh is running in my blood، وہ ایم اے او کالج کی الفت بلکہ عقیدت میں ایسے لت پت ہوئے (ممتاز مفتی نے اس لفظ کو کیسی توقیر بخش دی ہے!) کہ ذاکر علی خان نے تو بے ساختگی میں اپنا نام علی گڑھ خان ہی بتا ڈالا تھا، یا بنا ڈالا تھا! مگر شیام کرشن نے تو اسے اپنی سانس کی آمد و شد بنا لیا تھا: کیسا فدائی تھا علی گڑھ کا، اور کیسی کیسی کوششیں کی اس عاشق صادق نے اس علی گڑھ کالج کو زندہ متحرک اور اپنے زمانے سے جڑا رکھنے کے لئے کہ رشید صاحب بھی اس کے قائل بلکہ پرستار سے ہو گئے تھے۔ رشید/بھٹناگر خط و کتابت سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھٹناگر صاحب کی کتاب تو تیار ہو گئی تھی، مگر اس کی اشاعت کا کوئی سروسامان نظر نہ آتا تھا، اور کیسے بڑے بڑے آدمی علی گڑھ کے بڑے بڑے وابستگان اس وقت موجود تھے: ڈاکٹر سید محمود، کرنل زیدی، ڈاکٹر ذاکر حسین، خواجہ غلام السیدین، اور کون کون! اور شیام کرشن بھٹناگر علی گڑھ کی خاطر ان سب سے اور نہ جانے کس کس سے دریوزہ گری کرنے نکلے، تو لے دے کے ایک رشید احمد صدیقی دست گیری کو آئے، مگر لگتا ہے اس زمانے میں (۱۹۶۵ء) کے آس پاس کتاب کی اشاعت ایسا سخت مرحلہ تھی، (اور اس کتاب کی اشاعت جو علی گڑھ کالج کے بارے میں ایک غیر معمولی دستاویزی کارنامہ ہو گئی تھی) کہ کوئی پبلشر اسے چھاپنے کے لئے آگے نہ بڑھا، حتی کہ خود یونیورسٹی کی طرف سے بھی کوئی پیشکش نہ ہوئی۔

یہ کتاب انگریزی میں تھی اور رشید احمد صدیقی اسے پڑھ چکے تھے، شاید نوک پلک بھی درست کی ہو، (رشید صاحب کے عاشق صادق، فرخ جلالی مرحوم کی تو یہ روایت ہے) اس

وقت کے موجود علیگڑھ کے اتنے بڑے بڑے فرزند موجود تھے! علی گڑھ کالج پر انگریزی میں پہلی بڑی کتاب مرتب ہوئی تھی، لوگوں میں چرچا بھی کافی ہوگیا تھا، مگر کئی سال گذر گئے اور یہ مسودے کی شکل ہی میں علی گڑھ والوں کی بے حسی کا تماشہ دیکھتی رہی۔

پھر یہ ہوا کہ خلیق احمد نظامی صاحب مرحوم ذاکر صاحب کے کہنے سننے سے اور علیم صاحب کے اصرار سے سرسید ہال کے پروووسٹ ہوگئے، تو انھوں نے ہال کے طلبہ کو اس کتاب کی اشاعت میں مدد کرنے پر آمادہ کرلیا، طلبہ نے تجویز کا خیر مقدم کیا اور بالآخر یہ کتاب علیم صاحب کے پیش لفظ اور خلیق احمد نظامی صاحب کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوگئی۔ وقعت بڑھانے کے لئے دہلی کے ایشیا پبلشنگ ہاؤس سے اس زمانے میں علی گڑھ والوں کا خاصہ ربط و ضبط ہوگیا تھا، 'ایشیا' والوں کا نام بھی س پر ثبت کر دیا گیا، اگر چہ حسن سیرت کے باوجود حسن صورت کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں ہو پائی، کاغذ بھی شاید نیوز پرنٹ تھا، جیسا بھی، جتنا کچھ بھی ہوا، بہت ہوگیا۔ اور ان خطوں کے مطالعہ کے بعد تو اندازہ ہوتا ہے کہ اتنا کچھ ہوگیا، جس کی رشید صاحب کو تو کوئی امید رہی تھی نہ بھٹناگر صاحب کو۔

کتاب کی اشاعت کے بارے میں میری زبانی کچھ چند باتیں جو آپ نے سنیں۔ اصل چیز، جو اس پورے مرحلے کے طے ہونے کے بہانے اردو والوں کو مل گئی، اور جو میں نے اب تک بڑی حفاظت سے اور بڑی محبت سے سنبھالے رکھی ہے، وہ اب ادب دوستوں کی نذر کر رہی ہوں۔

اللہ رشید صاحب اور بھٹناگر صاحب دونوں کی مغفرت کرے۔

(ڈاکٹر) ذکیہ جیلانی
مزمل منزل کمپاؤنڈ، سول لائن، علی گڑھ

1

ذکاءاللہ روڈ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۱۳؍نومبر (بوقت شب)

محبّ مکرم بھٹناگر صاحب، تسلیم۔ نامۂ گرامی صادر ہوا۔ شرمندہ ہوں کہ **بک صاحب** پر آپ کے مقالے کا مطالعہ ختم نہ کرسکا۔ اب انشاءاللہ کردوں گا۔
ادھر کچھ ایسے مشاغل میں پھنسا رہا کہ کسی معقول خدمت کی طرف توجہ نہ کرسکا۔ اپنی لکھی ہوئی ایک چیز آپ کے لیے بڑی مشکل سے فراہم کی تھی۔ وہ دوسرے صاحب کی نذر ہوگئی۔ اب ان سے مانگے کون اور کیسے!

جس کتاب کا آپ سے وعدہ کرچکا ہوں وہ بھیج رہا ہوں۔ وعدہ شاید ایک کا کیا تھا دوسری بھی یاد آ گئی تو اس پر آپ کا حق ہوگیا اس لیے اسے بھی بھیجتا ہوں۔ اگر ان میں سے کوئی کتاب آپ کی نظر سے گزر چکی ہو تو بھی وہ آپ کی ملکیت متصور ہوگی۔

چاہتا ہوں کہ بک صاحب پر آپ کا جو مقالہ میرے پاس ہے اس کو پڑھ لوں تو پھر تفصیل سے گفتگو کروں۔ اس لیے اس وقت تک ملاقات ملتوی رہے تو بہتر ہوگا ورنہ موضوع بحث کیا رہے گا۔

یوں آپ سے ملنا ہمیشہ خوشی اور فخر کا باعث رہے گا۔ کاش آپ ایسے وقت آئیں جب یہاں چائے کا دور چل رہا ہو، تاکہ مجھے کوئی زحمت یا زیرباری نہ ہو اور آپ خواہ مخواہ میرے احسان مند بھی نہ ہوں!!

مخلص
رشید احمد صدیقی

''**۱۳نومبر**'' کے اس خط کا سال غالباً ۱۹۶۰ء رہا ہوگا کیوں کہ بھٹناگر صاحب کا علیگڑھ میں ورود ۱۹۵۹ء میں ہوا، خط کی تاریخ موجود ہے بلکہ ''بوقت شب'' بھی موجود ہے، لیکن سال غائب ہے۔ اندازہ ہے کہ سال غالباً ۱۹۶۰ء ہی رہا ہوگا۔ بھٹناگر صاحب کی علی گڑھ کالج پر کتاب، جو اس مجموعہ مکاتیب رشید کا مرکزی تھیم ہے، ابھی اس کا ذکر نہیں چھیڑا ہے، تاہم اس سے دلچسپی کے آثار علیگڑھ کالج کے پرنسپل کے تذکرے سے نمایاں ہیں۔ اگلے کئی خط دسمبر ۱۹۶۰ء کے ہیں اس لئے یہ نومبر بھی ۱۹۶۰ء ہی کا رہا ہوگا۔

بک صاحب سے مراد ہیں تھیوڈور بیک (Theodore Beck)، علی گڑھ کالج کے، سرسید کے منتخب کردہ نوجوان پرنسپل۔ (بک صاحب پر بھٹناگر صاحب کا مقالہ جب کبھی دستیاب ہوجائے، اس کتاب کا ضمیمہ بنا دینا چاہئے۔)

☆☆☆

2

۵/دسمبر ۱۹۶۰ء

بھٹنا گر صاحب مکرم، آداب

آپ کی کتاب کے بارے میں میں خود فکر میں ہوں کہ یونیورسٹی اسے شائع کرے۔ کل سیدین صاحب سے دیر تک اس سلسلے میں گفتگو کی، انھوں نے فرمایا کہ وہ وائس چانسلر صاحب سے ذکر کریں گے۔ عجیب بات ہے کہ آپ سے پہلے یہ بات میرے ذہن میں آئی۔

آشفتہ بیانی پر آپ کی نظم کا میگزین میں شائع ہونا مجھے **اچھا نہیں معلوم ہوتا**(۱).....

ایسا کیجئے کہ ہم آپ دونوں ان مسائل پر تھوڑی دیر تک گفتگو کر لیں، کل آدھ گھنٹے کے لیے، تو دس بجے دن کے درمیان تشریف لا سکتے تو بہتر ہوگا، ورنہ پھر پرسوں!

آپ کا
رشید احمد صدیقی

(۱) اس کے بعد خط کا کاغذ تھوڑا سا پھٹ گیا ہے۔

☆☆☆

3

۳۰/۳۱ دسمبر ۱۹۶۰ء

بھٹنا گر صاحب مکرم، آداب

کل آپ کا عنایت نامہ صادر ہوا تھا۔ لیکن موقعہ نہ ملا کہ جواب بھیج سکتا۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ آج آپ پروفیسر **شیخ عبدالرشید** صاحب سے مل لیں جو پروفیسر **محمد حبیب** صاحب کے مہمان ہیں لیکن طبیعت اچھی نہیں رہتی اس لیے کہیں باہر نہیں جا سکتے۔ آپ نے سرسید پر جو کام کیا ہے اس کو دیکھنے کے وہ بہت مشتاق ہیں اور اس سے زیادہ آپ سے ملنے کے۔ مجھ سے تو جب چاہیے گا ملتے رہیے گا، میں کہیں باہر تو جاتا نہیں۔

نیا سال مبارک ہو۔ کیا حرج اگر ایک دن پہلے ہی ایسا ہو!

آپ کا

رشید احمد صدیقی

یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر، اور صدر شعبہ، کئی کتابوں کے مدون و مترجم، پروفیسر **شیخ عبدالرشید** آزادی کے بعد کے علی گڑھ کے اکابرین میں سے تھے۔ رٹائر ہونے کے بعد ۱۹۶۰ کے آس پاس اپنے وطن پاکستانی پنجاب چلے گئے تھے، وہیں ۱۹۸۰ء میں وفات پائی۔ **حبیب صاحب** تاریخ و سیاسیات کے صدر شعبہ تھے، پھر شعبہ ۱۹۵۳ء میں دولخت ہوا۔ شعبہ دو حصوں میں منقسم ہونے کے بعد سیاسیات حبیب صاحب کے حصے میں آئی، تاریخ شیخ صاحب کے حصے میں۔

اس خط کی تاریخ ۳۰ر دسمبر یا ۳۱ دسمبر ۱۹۶۰ء ٹھہرائی گئی ہے۔ اور وہ اس لئے کہ اگلے خط مؤرخہ ۴ جنوری ۱۹۶۱ء میں رشید صاحب نے بھٹنا گر صاحب کو لکھا ہے کہ ''کل پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب سے معلوم ہو کر اطمینان خوشی ہوئی کہ آپ سے مل لیے''۔ تو سال تو طے ہو ہی گیا یعنی ۱۹۶۱ء کے جنوری سے پہلے کا سال ہے جو ختم ہونے والا ہے اور نیا سال آنے والا ہے جس کی مبارک باد بھی دی گئی ہے۔ سال کے ساتھ تاریخ بھی اس طرح طے ہو جاتی ہے کہ خط میں درج ہے کہ ''نیا سال مبارک ہو، کیا حرج ایک دن پہلے ہی ایسا ہو۔ تو نیا سال آنے سے ایک دن پہلے کی تاریخ ۳۱ دسمبر ہی ٹھہرتی ہے۔ یا بھول چوک میں ایک دن کی رعایت کر لیں تو ۳۰ دسمبر!

☆

4

۴؍جنوری ۱۹۶۱ء

بھٹناگر صاحب محترم، آداب

کل پروفیسر **شیخ عبدالرشید** صاحب سے معلوم ہوکر اطمینان اور خوشی ہوئی کہ آپ موصوف سے مل لیے۔ یہ بڑا اچھا ہوا۔

میں آپ کا دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس سلسلے میں اتنی زحمت اٹھائی۔ میرے ہی متواتر اصرار پر آپ نے یہ کیا۔

مجھ سے ملنے کے لیے آپ دن اور وقت مقرر کرنے کی کیوں ضرورت سمجھتے ہیں۔ تقریباً تمام وقت بالخصوص 3P.M سے رات گئے تک گھر ہی پر رہتا ہوں۔ اول وقت آپ شاید نہ خالی رہتے ہوں ورنہ وہ بھی موزوں ہے۔ گھر پر نہیں تو **نئی لائبریری** میں مل جاؤں گا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

یونیورسٹی لائبریری کی قدیم عمارت سرسید ہال میں تھی، اس وقت اس کا نام لٹن لائبریری تھا۔ اس لائبریری کا مخطوطات سیکشن اس وقت سلطان جہاں منزل (کانفرنس کمپاؤنڈ) کے مرکزی ہال میں رکھا گیا تھا، جہاں مشہور محقق ڈاکٹر مختار الدین احمد اس کے انچارج (مددگار لائبریرین) تھے۔ ان کے جانشیں سید سبط الحسن صاحب ہوئے جو علوم اسلامیہ کے فاضل تھے "نہج البلاغہ" پر قابل توجہ تحقیقاتی کتابیں لکھ چکے تھے۔ **نئی لائبریری** جس کی طرف اس خط میں اشارہ ہے، ذاکر صاحب کے زمانے میں جس کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا، اور زیدی صاحب کے زمانے میں جس کا افتتاح ہوا، اس سے مراد وہ نئی عمارت ہے جہاں اب یونیورسٹی لائبریری ہے، اور جس کا نام اب مولانا آزاد لائبریری ہے۔

☆☆☆

5

۱۵/اپریل ۱۹۶۱ء

محبّ مکرم، آداب

کل آپ کا عنایت نامہ مجھے مل گیا تھا۔ اس کا جواب آپ کو دینا اتنا ضروری نہیں سمجھا گیا جتنا **بشیر صاحب** سے ''جواب طلب'' کرنا۔ چنانچہ میں نے صورت حال انکو بتائی۔ انھوں نے ارباب متعلقہ کو میرے سامنے بلا کر تاکید کر دی کہ آپ کو ساری سہولتیں فراہم کی جائیں۔ کل بارہ بجے دن کے قریب وہ آپ سے ٹیلیفون پر گفتگو کر رہے تھے میں ان کے قریب موجود تھا۔ آج وہ شاید دہلی گئے ہیں ورنہ ان سے معلوم کرتا کہ آپ سے چھ بجے شام کیا باتیں طے ہوئیں۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

بشیر صاحب سے مراد پروفیسر سید بشیر الدین۔ یونیورسٹی کے فاؤنڈر لائبریرین کہنا چاہئے۔ اڑیسہ سے آئے تو علیگڑھ میں لیب اسسٹنٹ ہوئے، مدت تک کسی پروفیسر انچارج کو لائبریرین ذمہ داری ملی رہی، پھر بشیر صاحب لائبریرین ہو گئے اور آہستہ آہستہ ملک کے بڑے لائبریرین صاحبان میں شمار ہونے لگے، اتنے بڑے کہ یہاں سے ریٹائر ہوئے جے پور نے بلا لیا، پھر کشمیر نے بلایا، پھر دہلی یونیورسٹی نے۔ علی گڑھ ہی میں مکان بنا لیا تھا، یہیں ۱۹۸۰ء کے آس پاس وفات پائی۔ رشید صاحب کے روزانہ کے ملنے والوں میں تھے، جن سے رشید صاحب کو تازہ ترین کتابیں سب سے پہلے پڑھنے کو مل جاتی تھیں، خاص کر انگریزی کی۔

☆☆☆

6

۲۲ رمئی ۱۹۶۱ء

محترمی، آداب۔ ہم آپ ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں کہ آنے جانے ملنے ملانے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اب اس عید کو بھی گزر جانے دیجئے تو کسی وقت حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔ موسم اتنا نامعقول ہے کہ نہ تکلف (*کندا*) ہوتا ہے نہ کسی شریف آدمی کو بلانے کی ہمت ہوتی ہے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

مندرجہ بالا رقعہ بھٹناگر صاحب کو، ان کے پرچے کے جواب میں، اسی کی پشت پر لکھ دیا ہے۔ بھٹناگر صاحب نے لکھا تھا:

(۲۲ رمئی ۱۹۶۱ء)

جناب صدیقی صاحب، آداب

عید گزشتہ پر وعدہ جناب نے بیورو میں تشریف لانے کا کیا تھا۔ اب تو دوسری عید کی آمد ہے۔ **غالب کے برخلاف** وعدہ پر جی رہا ہوں آپ سے کئی باتوں میں رائے لینی ہے۔ کچھ لکھا ہوا دکھانا بھی ہے۔ اگر آپ تشریف نہ لاسکیں تو جب آپ فرمائیں حاضر ہوؤں۔ ذرا اس بیورو کو بھی ایک دفعہ تو دیکھئے۔ زیادہ آداب

کمترین
شام کرشن بھٹناگر

بھٹناگر صاحب نے اوپر، غالب کے اس شعر کی طرف اشارہ کیا ہے:

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا۔ کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

☆☆☆

7

۱۹؍ستمبر ۱۹۶۱ء

مجبی، تصاویر بہت اچھی ہیں۔ Enlargement سب کا بہت اچھا رہے گا سوا پروفیسر **ماریسن** کے ایڈریس کے۔ وہ بہت ہی دھندلا ہے۔ خیر اس پر فرصت سے پھر کبھی گفتگو ہوگی۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

ماریسن، پرنسپل بیک کی وفات کے بعد علی گڑھ کالج میں ان کے جانشیں پرنسپل ہوئے تھے۔

☆☆☆

8

۲۹ ستمبر ۱۹۶۱ء

مجی۔ بہت بہت شکریہ۔ عنایت نامے کا جواب فرصت سے دوں گا۔
ذاکر صاحب آنے والے تھے لیکن پھر پروگرام ملتوی ہوگیا۔ اب اکتوبر میں تشریف لائیں گے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

ذاکر صاحب سے مراد ڈاکٹر ذاکر حسین جو اس وقت بہار کے گورنر تھے۔
یہ چند لائنیں اس لفافے پر لکھی ہیں جو بھٹناگر صاحب نے بھیجا تھا۔

☆☆☆

9

۱۹/دسمبر ۱۹۶۱ء

بھٹنا گر صاحب مکرم، آداب۔ **مولوی صاحب** کی نظم کے جواب میں آپ کی نظم موصول ہوئی۔ آپ کو انگریزی نظم ونثر لکھنے پر بڑی قدرت ہے۔ میری طرف سے مبارک باد قبول فرمایئے۔ **احسان** کو آپ کا خط پہنچا دیا گیا۔ آپ کے دونوں ٹائپ شدہ مسودے بھیجتا ہوں۔ خوب ہیں ذرا طویل ہیں لیکن اس طرح کافی مستند میٹیریل آپ نے یکجا کر دیا ہے جو اب تک کسی سے نہ ہوسکا تھا۔ آپ نے جو میٹیریل فراہم کر دیا ہے وہ بڑا قیمتی ہے اور بیش از بیش فائدہ اس سے وہ لوگ اٹھائیں گے جو علی گڑھ تحریک پر آئندہ تصنیف کا کام کریں گے۔ کاش آپ نے اسی توجہ اور محنت سے اقتباسات کے حوالے فٹ نوٹ میں درج کر دیئے ہوتے۔ جہاں تہاں درج کیے ہیں لیکن کم ہیں۔ اگر یہ حوالے کافی ہوتے تو آپ کی اس کتاب کی وقعت اور زیادہ بڑھ جاتی مجھے جو چیز جہاں کھٹکتی ہے وہاں نشانات لگا دیئے ہیں۔ اور کہیں کہیں الفاظ یا فقرے ادھر اُدھر کر دیے ہیں۔ کہیں ایسا بھی محسوس ہوا جیسے واقعات دہرا دیئے گئے ہوں لیکن آپ میرے اس لکھنے سے تردد میں نہ پڑ جایئے گا۔ ممکن ہے یہ اندیشے بے بنیاد ہوں اور تجاویز کچھ **ایسی ہی ویسی ہوں**۔

ادھر کچھ دنوں سے بہت سی پریشانیوں میں مبتلا ہوں اور یہ ایسی ہیں جو زندگی میں اب دور نہ ہوں گی۔ اس لیے کام کرنے میں جی نہیں لگتا لیکن دنیا کا کاروبار رکا بھی نہیں رہتا۔ جو کچھ بن پڑتا ہے کرتا رہتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ اس طرح کام کرنے میں نہ خوشی ہوتی ہے نہ حوصلہ۔ جس کے بغیر کام کرنے کا حق

ادا نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ بات تو یونہی لکھ گیا۔ خیال آیا کہ مسودوں کے دیکھنے میں دیر ہوتی اس لیے آپ کسی غلط فہمی میں نہ مبتلا ہوں۔ اس لیے یہ نج کی بات لکھنا پڑی۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(پنسل سے) مولوی **مقتدا خانصاحب** کی عرضی سے (متعلق) ایک خط ہے جو موصوف کے حوالے کر دیجئے گا۔

مولوی صاحب یا مقتدا خاں صاحب شروانی، علی گڑھ کی مشہور شخصیت تھے اور ہمارے نواب رحمت اللہ خاں صاحب شروانی کے خالو تھے (نواب صاحب بڑے پیار سے ان کا ذکر کرتے تھے)۔ یونیورسٹی پریس کے مہتمم تھے جہاں سے ان کے اہتمام میں سینکڑوں کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے بھی اکابر میں تھے، ایک تھیلا، تھیلے میں بہت سے کاغذ اور یونیورسٹی کی شمشاد بلڈنگ سے لے کر وکٹوریہ گیٹ تک کی، اور ارد گرد کی پیادہ پا راہ پیمائی!، روزانہ دس پندرہ میل چل ہی لیتے ہوں گے سفید داڑھی، کھدر کا سفید کرتا، ڈھیلا ڈھالا پاجامہ اور کپڑے ہی کی ٹوپی: ایسے فرشتے ۱۹۶۰ء کے بعد تیزی سے معدوم ہوتے چلے گئے۔

احسان سے مراد رشید احمد صدیقی صاحب کے فرزند ڈاکٹر احسان رشید جو ذاکر صاحب کے باوجود علی گڑھ کے اکنامکس کے شعبہ میں لکچرر سے آگے ترقی نہ کر سکے تو کراچی سدھار گئے جہاں وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے، اور پھر جارڈن کے سفیر۔ باپ سے ملنے کبھی کبھی علی گڑھ آتے رہتے تھے۔ ۱۹۹۰ء کے آس پاس وفات پائی۔

ایسی ویسی کو، زبان کے حاکم اعلیٰ نے توڑ کے ایک لفظ 'ہی' کو درمیان میں لا کے، اصل سے بہتر مطلب براری کا کام لے کے زبان کو جو وسعت دینے کی کوشش کی ہے، توجہ کی طالب ہے

یہ خط بھی رشید صاحب نے یونیورسٹی کے کس ردی کاغذ کے سادہ حصے کو پھاڑ کے اس پر لکھا ہے۔

☆☆☆

10

۳/مارچ ۱۹۶۲ء

جناب بھٹنا گر صاحب مکرم، آداب

آپ نے خاں صاحب کو جو خط لکھا تھا وہ موصوف نے میرے پاس بھیج دیا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اتنا اچھا خط **خاں صاحب** کو لکھ دیا۔ کام تو دراصل آپ نے کیا ہے اور اس کی آرائش وزیبائش خانصاحب نے کی ہے۔ میں آپ کی اس مہم میں کسی تعریف کا مستحق نہیں ہوں۔ یوں شریفوں کا شیوہ ہوتا ہے کہ وہ دور والوں سے بھی محبت اور عزت کرتے ہیں۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

خاں صاحب سے مراد غالباً رشید صاحب کے گہرے دوست، فارسی والے حمید الدین خاں صاحب ہیں ان کے ساتھ رشید صاحب کی روزانہ کی نشست رہتی تھی۔

☆☆☆

11

۱۷/اپریل۱۹۶۲ء

مجی، تسلیم

اخبار کا شکریہ۔ اس کی دو کاپیاں مجھے پہلے سے مل چکی تھیں۔ میرے یہاں یہ ادھر ادھر ہو جائیں گی اس لیے پڑھنے کے بعد تینوں نسخے آپ کی نذر کرتا ہوں ممکن ہے دوستوں کی خدمت میں بھیجنے کے لیے آپ کو زائد کاپیوں کی ضرورت پڑے۔

مضمون کے بارے میں کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔ یہاں سب نے بہت پسند کیا اور آپ کی محنت اور محبت کے شکر گزار ہوئے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

☆☆☆

12

۱۱/مارچ ۱۹۶۳ء

بھٹناگر صاحب محترم، تسلیم

روشنائی سے لکھنا شروع کیا تھا لیکن معلوم ہوا کہ یہ کاغذ **بلاٹنگ پیپر** قسم کا ہے اس لیے **پنسل سے لکھنے** کی معذرت سے چاہتا ہوں۔

ہولی کی تقریب مبارک ہو۔ کل شام آپ کی طرف آنے کا قصد کیا تھا لیکن کل ہی **ہولی ملاپ کی تقریب اسٹاف کلب** میں تھی وہاں چلا گیا۔ خیال تھا ممکن ہے آپ بھی مل جائیں لیکن حسب معمول ملاقات نہ ہوسکی توفیق ہوئی تو آج کسی وقت حاضر ہوں گا۔ لیکن سچ پوچھیے تو جی چاہتا تھا کہ آپ کی تصنیف کے لئے کسی عطیہ کی خبر آتی تو پھر خوشی منائی جاتی **لیکن کیا کیجئے کہ، نہ چھوٹوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور نہ بڑوں کے وعدے۔**

آپ کا
رشید احمد صدیقی

بلاٹنگ پیپر، آج کے عہد میں جب نہ روشنائی کا کام ہے نہ قلم کا نہ فاؤنٹن پین کا، یہ روشنائی کو جذب کرنے والا موٹا کاغذ اب ایسے ہی کسی خط میں نظر آجائے تو آجائے۔

پنسل سے لکھنے کا یہاں تو ایک عذر نکل آیا! مگر ہوتا یہ تھا کہ سامنے جو بھی کچھ فوری طور سے میسر آجائے، کاغذ کی قسم میں یا کاغذ پر لکھنے کے اوزار کی قسم میں، رشید صاحب اسے استعمال کرنے سے چوکتے نہیں تھے۔ ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ پر، کے۔ ایم منشی کی کتاب کے خلاف احتجاج کی افتاد کے موقع پر رشید صاحب نے **علیگ** کے لئے جو طویل مضمون لکھا تھا وہ پورا پورا کاپنسل سے لکھا گیا تھا۔

ہولی کی مبارکی بھٹناگر صاحب کو؛ اور اسٹاف کلب میں ملاپ کی تقریب! آزادی کو ابھی ۱۵، ۱۶ سال ہی گزرے ہیں۔

خط کا آخری جملہ، انشائے رشیدی کا ایک خوبصورت جملہ!

☆☆☆

13

۲ر ستمبر ۱۹۶۳ء

مجی بھٹنا گر صاحب، تسلیم

اب میرا کوئی تعلق **لائبریری** سے نہیں رہا۔ وہ **پروجکٹ** ختم ہو گیا جس میں کام کرتا تھا۔ **زیدی صاحب** تشریف لائے اور آپ کا مطلب پورا نہ ہوا۔ کیا کہیے!

بقیہ بروقت ملاقات، جب کبھی ہو جائے۔

آپ کا

رشید احمد

پروجکٹ سے مراد ہے ''سرسید کا مغربی تعلیم کا تصور'' جو رشید صاحب نے ریٹائرمنٹ کے بعد یو جی سی کی گرانٹ اور جنرل ایجوکیشن سینٹر کے اہتمام میں اردو میں لکھا، جو بعد میں خدا بخش لائبریری کی طرف سے شائع ہوا۔ اس پروجکٹ کے لئے رشید صاحب کا لائبریری آنا جانا زیادہ رہتا ہوگا۔

زیدی صاحب سے مراد کرنل بشیر حسین زیدی ہیں، علی گڑھ میں ذاکر صاحب کے جانشین، ۱۹۵۶ء-۱۹۶۲ء؛ کیمبرج کے گریجویٹ، پھر منٹو سرکل کے ہیڈ ماسٹر، پھر ریاست رام پور کے وزیر اعلی، پھر علی گڑھ میں وی سی، پھر ممبر پارلیمنٹ۔ یہ باثروت بھی تھے اور بااثر بھی، اس لئے ان کی طرف خیال گیا کہ کتاب کی اشاعت میں شاید ان سے مدد مل سکے۔

☆☆☆

14

۲؍ستمبر۱۹۶۳ء

بھٹنا گر صاحب مکرم، آداب

میرے ایک دوست اور کالج کے ساتھی **نورالرحمٰن** صاحب ہیں۔ آپ کی ٹائپ شدہ تصنیف دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج یا قباحت نہیں ہے اس کا بھی ذمہ لیتا ہوں۔ اگر کوئی Spare Set ہو تو چند دنوں کے لیے مرحمت فرمائیے۔

خاں صاحب نے بھی سفارش کی ہے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے علی گڑھ کے دور میں جامعہ کے فعال کارکن رہے، مکتبہ جامعہ سے اسی زمانے میں میر تقی میر کی کلام کا ایک انتخاب بھی انہیں کا کیا ہوا شائع ہوا تھا۔

☆☆☆

15

۹ رفروری ۱۹۶۴ء (اتوار)

ذکاءاللہ روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، آداب۔ ۲۴ ردسمبر کا لکھا ہوا آپ کا دستی خط کل شام ملا۔ آپ کے وہاں بخیریت تمام پہنچ جانے کی خبر اس سے بہت پہلے اس چپراسی سے مل گئی تھی جو آپ کو وہاں پہنچا کر آیا تھا۔ بارے، آپ وہاں پہنچ گئے اور زندگی کے دھندے میں لگ گئے۔ خدا اپنی امان میں رکھے۔ آمین

آپ نے علی گڑھ، اس کے بانی اور ان کا بھلا چاہنے والوں کے بارے میں جن شریفانہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں وہ علی گڑھ ہی کے لیے نہیں باعث فخر ہے خود آپ کے لیے بھی ہے۔ شریفانہ خیالات کا اظہار شریف ہی کر سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس اعتبار سے آپ علی گڑھ کو بہت کچھ دے گئے اور بہت کچھ علی گڑھ سے لے بھی گئے۔ دونوں کو مبارک ہو۔

میر غلام حسین صاحب کو بھی Locate نہ کر سکا ہو سکے تو پتہ لگائیے گا کہ وہ مجھے جانتے ہیں یا نہیں۔ پھر گفتگو کی صورت نکل سکے گی۔ آپ جہاں رہتے تھے، ادھر کا جانا اب بالکل بند ہے۔ **ادھر اب صرف خیال جاتا رہتا ہے**۔ وہاں کسے دیکھنے جاؤں سوا اس کے کہ کبھی ادھر سے گزر ہو تو آپ بے اختیار یاد آتے ہیں کہ **علی گڑھ میں آپ نے ایک اہم کتاب لکھ ڈالی**۔

دعا کرتا ہوں کہ کشمیر میں اس کے چھپ جانے کی کوئی صورت نکل آئے۔ آپ جب تشریف لے گئے ہیں تو سردی کی بڑی شدت تھی۔ راستے میں کیسی گزری۔ **جموں** میں بھی اس کا غلبہ کچھ کم نہ رہا ہوگا۔

اچھا خدا حافظ　　آپ کا، رشید احمد صدیقی

اوپر جو سطریں بولڈ یا کالی کر دی گئی ہیں وہ آپ کی توجہ کے لئے ہیں، انشائے رشیدی کے خوبصورت نمونے کے طور پر ملاحظہ ہوں۔
جموں کے ذکر کا سلسلہ یہ کہ بھٹناگر صاحب کا علی گڑھ کے روزگار دفتر یا ایمپلائمنٹ بیورو سے جموں کے دفتر میں تبادلہ ہو گیا تھا۔
اہم کتاب سے مراد بھٹناگر صاحب کی علی گڑھ کے بارے میں کتاب جو ان خطوں میں جا بجا مذکور ہے۔

☆☆☆

16

۲۶رفروری۱۹۶۴ء

ذکاءاللہ روڈ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبی، تسلیم۔عید مبارک کا کارڈ صادر ہوا۔شکر گزار ہوں۔آج سے ہولی شروع ہوئی ہے۔اس لیے اس جواب میں ہولی کی تہنیت بھیجنے کا موقع ملا۔علی گڑھ سے باہر اتنے دور دراز مقام پر آج سے پہلے ہولی منانے کا آپ کو کب موقع ملا ہوگا۔اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے۔

آپ نے اپنا پتہ نہیں لکھا۔انداز سے جو کچھ ..... پتہ ہر خط پر لکھ دیا کیجئے۔اس سے جواب دینے والے کو بڑی سہولت ہوتی ہے۔

جموں کے گرد و پیش سے ہم آہنگ ہو گئے؟

کتاب کا کیا ہو رہا ہے؟

ہم سب بخیر ہیں اور آپ کی صحت و عافیت کے.....

آپ کا
رشید احمد صدیقی

نکتے لگانے سے مراد یہ ہے کہ یہاں کارڈ پھٹا ہوا ہے۔

کتاب سے مراد وہ علی گڑھ کالج پر بھٹناگر صاحب کی کتاب ہے جس کی اشاعت سے مصنف سے زیادہ اب رشید صاحب کو دلچسپی ہو گئی تھی

☆☆☆

17

۱۶/اپریل ۱۹۶۴ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

محبّ مکرم، آداب۔ محبت نامہ پرسوں ملا۔ کل ایک تقریر ریکارڈ کرانے دہلی چلا گیا تھا۔ ہمروزہ واپس آیا۔ ممکن ہو تو ۲۱/اپریل کو ساڑھے نو اور دس بجے رات کو دہلی اسٹیشن سے سنیے گا۔

آپ کا خط پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے کشمیر کی قدرتی فضائیں تر و تازہ کر جائیں۔

طالب علمی کے زمانے کے ایک ساتھی کا خط آیا تھا جس میں انھوں نے **محسن الملک ہال** پر آپ کا مضمون پڑھ کر لکھا تھا کہ یہ بھٹنا گر کون ہے۔ بڑا ''پرانا'' معلوم ہوتا ہے۔ ''پرانا'' (اسے کھینچ کر پڑھیے) بڑا جامع لفظ ہے۔ علی گڑھ کے کھلنڈروں کے نزدیک یہ بہت بڑا Compliment ہے جو وہ اپنے قبیلے کے کسی فرد کو دے سکتے ہیں۔

زیدی صاحب کو میں نہ لکھوں گا۔ آپ بھی وہاں نہ لکھیے۔ ایسے کام کے لیے بار بار عرض معروض کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میں ڈاکٹر **سید محمود** صاحب کو ضرور لکھوں گا۔ یقین مانیے اپنی معذوریوں کے باوجود بڑی مدد کرتے ہیں۔ آپ کا کام اتنے اعلیٰ درجے کا ہے کہ اس کی حمایت کرنے والوں کی تعداد بڑھتی ہی رہے گی گھٹے گی کبھی نہیں۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ دشواریوں میں اور زیادہ مستعدی سے کام کرنے لگے ہیں۔ مشکل کو آسان کرنے اور اطمینان قلب کے لیے اس سے بہتر

کوئی نسخہ نہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے لوگوں نے بڑی سے بڑی آزمائش میں اسی پر عمل کیا ہے۔ وہاں کے علی گڑھ والے علی گڑھ کو نا قابل اعتناء سمجھتے ہیں اس کا افسوس ہوا۔ **کوئی شخص اپنی ماں اور اپنی مادر درسگاہ کو کبھی نہیں بھولتا۔**

احسان نہیں آئے تھے صرف ان کی بیوی نادرہ آئی تھی جو سوا مہینے رہ کر واپس گئی۔ میرے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا جواب میں نے اس عریضے کی ابتدا میں دے دیا ہے۔

دعا گو

رشید احمد صدیقی

ڈاکٹر سید محمود علی گڑھ کے مایہ ناز فرزندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ۱۹۰۷ء کے اسٹرائک کے لیڈر۔ خلافت اور کانگریس کے اکابر میں رہے۔ جواہر لال نہرو کی وزارت میں شامل تھے اور وزیر برائے وزارت خارجہ کہلاتے تھے۔ آخری بار نواب علی یاور جنگ کے قضیہ میں علی گڑھ پر جو افتاد پڑی، ملت کے ان اکابر اس وقت کے رہنماؤں میں یہ بھی شامل ہو گئے جو علی گڑھ کے تاریخی کردار کی بازیابی کے لئے تحریک چلا رہے تھے۔ ''علی گڑھ کا مسئلہ'' نامی کتاب میں اس زمانے کی ان کی تقریریں محفوظ ہیں۔ بھٹناگر صاحب کی کتاب چھپوانے کے سلسلے میں بطور ایک با اثر شخصیت ہونے کے، ڈاکٹر سید محمود کی طرف بھی خیال گیا۔

محسن الملک ہال پر بھٹناگر صاحب کا مضمون جب بھی ملے، اسے بھی اس کتاب کا ضمیمہ بنا دیا جائے

غور تو کیجئے، اعلی گڑھ پر اتنا اہم کام، اور ایسا بڑا پشت پناہ! اور کوئی مرد خدا مدد کے لئے نہیں اٹھتا! یہ سوال ان پیش نظر خطوط کو پڑھتے وقت آگے بھی بار بار اٹھے گا۔

ماں اور مادر درسگاہ: انشائے رشیدی

☆☆☆

18

۳۰/اپریل۱۹۶۴ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بھٹنا گر صاحب، خوش رہیے جیسا کہ آپ ہر حال میں رہتے ہیں۔ منظوم عید مبارک کا کارڈ ملا۔ اب یہاں کا موسم نامعقول ہونا شروع ہوگیا ہے اس کی تلافی معقول لوگوں سے ہو جاتی تھی۔ اب ان کا بھی قحط ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اچھے لوگ چور بازار میں بھی نہیں ملتے۔ ورنہ کسی قیمت یا کرایہ پر ان کو حاصل کر لیتا۔ آپ کا خط ملا تو آپ کی کتاب اور خط پڑھ کر سید محمود صاحب یاد آئے۔ موصوف کو آج ہی لکھوں گا ان بیچارے سے جو بن پڑے گا اس سے..... کریں گے۔

کام کرنے کا جی نہیں چاہتا اور بن کیے کام نہیں چلتا۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ کس عالم میں گزر رہی ہے۔ کبھی جموں سے نکل کر سری نگر وغیرہ بھی جانے کا ہوا؟..... کر..... اور وہاں سے تازہ دم ہو کر لوٹیے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

☆☆☆

19

۱۲؍مئی ۱۹۶۴ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، سلام شوق۔ ۱۰؍کا لفافہ ابھی ابھی ملا۔ پڑھ کر بڑا لطف آیا۔ جس لفظ کو جس طرح چاہا لکھ ڈالا۔ پھر آپ کی Hand Writing لب ولہجہ، سب نے وہ سماں پیدا کر دیا جیسے آپ یہاں اپنے آفس میں بلند آواز سے جلد جلد کسی کو ٹیلیفون کر رہے ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے کتے کو ڈانٹتے اور ملاقاتیوں کو چمکارتے جاتے ہوں۔

جموں میں آپ کو جو نئے تجربے ہو رہے ہیں وہ تکلیف دہ ضرور ہیں لیکن یقین رکھیے اس سے آپ کی کارکردگی میں اضافہ اور آپ کی شخصیت میں مزید دل آویزی پیدا ہوگی۔ پھر کتنے دن کی بات ہے جلد ہی انشاء اللہ مستقلاً دہلی آ جایئے گا۔ بچھڑے ملیں گے اور زندگی جموں کے ہندو مسلمانوں کی (محبت) کشمیر کے حسین قدرتی مناظر کی طرح پاکیزہ اور خوبصورت ہو جائے گی۔

مسٹر جارج میرا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ یونیورسٹی میں شاید ہی وہ کسی اور کا اتنا لحاظ رکھتے یا کام کر دیتے ہوں جتنا میرا۔ میں تو کبھی ٹھکانے سے ان کا شکریہ بھی نہ ادا کر سکا۔

اپنی کتاب کے بارے میں ہرگز نہ گھبرایئے۔ انشاء اللہ حسب مراد چھپ کر رہے گی ڈاکٹر سید محمود صاحب کو لکھا تھا۔ جواب نہ آیا معلوم نہیں کیا بات ہے .....۔ کتاب کے بارے میں فیصلہ کن بات اسی وقت ہوگی جب آپ دہلی تعینات ہو کر آ جائیں گے۔ زیدی صاحب بھی آ ہی جائیں گے۔ یاددہانی کرتے

رہیے شاید کام بن جائے۔

میری ریڈیو والی تقریر کا آپ نے اثر لیا۔ کیوں؟ آپ تو خدا اور اس کے ''فوائد'' کے قایل نہیں ہیں۔ بھٹنا گر صاحب کبھی کبھی خدا کا قائل ہوئے بغیر بھی آدمی اس کا قائل ہوتا ہے۔ احسان کا پتہ یہ ہے:

Dr. E. R. Siddiqi 41-K, 42nd street,
Block 6, P.E.C.H, Karachi

خاں صاحب کے پاس آپ کا خط پہنچا دیا گیا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

نکتوں سے مراد یہ ہے کہ یہاں کارڈ پھٹا ہوا ہے۔

☆☆☆

19-A

۱۰؍ستمبر۱۹۶۴ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

بھٹناگر صاحب قبلہ۔تسلیم ۸؍کا گرامی نامہ کل ۹؍کو مل گیا۔کل ہی سیدین صاحب سے آپ اور آپ کی کتاب (کے بارے) میں گفتگو کر رہا تھا۔ آپ کی ٹائپ شدہ Synopses اور مشاہیر کی رائے جو میرے پاس موجود تھے موصوف کی نذر کر دیا اور اس کی درخواست کی ہے کہ وزیر اعلیٰ کشمیر سے سفارش کر دیں۔..... بڑی دلچسپی کا اظہار کیا دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ پرسوں مسٹر جارج کو لکھا کہ آپ کا کوئی خط ان کے پاس کئی .....ان کا جواب اب تک نہ آیا.....شام تک ملنے آتے ہوں گے۔آپ لکھتے ہیں کہ طبیعت اچھی ہوگئی ہے لیکن مجھے اطمینان نہیں۔سرسوں کا تیل اور نمک وغیرہ چلتا ہوا عطائی علاج ہے۔اس پر بالکل بھروسہ نہ کیجیے۔کسی اچھے اسپتال میں مکمل چک اپ کرائیے اور اس کے مطابق علاج کرائیے۔

پہاڑ پر اسی.....تردد کی بات ہے،اس طرف سے.....،

احسان کا پتہ یہ ہے.....

خاں صاحب کی خدمت میں ..... براہ راست بھیج دیجیے۔اس سے .....
پولیٹیکل Influence والا مضمون کو ٹھیک ہے البتہ اکتوبر ۶۱ء والے قصہ کو کیوں چھیڑیے۔ بات آئی گئی ہوگئی.....اب اس میں کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی۔ممکن ہے وی۔سی بھی پسند نہ کریں۔ زیدی صاحب کو آپ اپنی کتاب کے بارے میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں، فائدہ کیا۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

☆☆☆

20

۲۲؍ستمبر۱۹۶۴ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبی، سلام شوق، محبت۔ مورخہ ۱۹؍کل ۲۱ کو ملا۔

ایک مفصل خط **سیدین صاحب** کو لکھا ہے آپ کے اس خط کو سامنے رکھ کر۔ دیکھیے کیا کہتے ہیں۔

صحت کے اعتبار سے مجھے جتنا ہونا چاہیے اتنا ہی ہوں۔ کبھی کبھی تفاوت ہو جاتا ہے۔ یہ سب آخری تفاوت کا پیش خیمہ ہے۔

آپ نے اپنی صحت کے بارے میں کچھ نہ لکھا۔ لیکن خط کے لب ولہجہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ چاق ہیں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

جارج علیل ہو گئے تھے اب بخیر ہیں۔ میرا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ ان میں بڑی شرافت نفس اور وضعداری ہے۔ خدا ان کو خوش رکھے۔ سب کو دعا سلام۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

سیدین صاحب سے مراد خواجہ غلام السیدین جو لیڈس یونیورسٹی سے تعلیمات میں اعلی ڈگری لے کر آئے تو مسلم یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ کشمیر، ممبئی، اور رام پور میں تعلیمی مشیر رہے۔ اب ہندوستان آزاد ہو گیا تھا تو یہ مولانا آزاد کی وزارت میں ان کے تعلیمی مشیر/سکریٹری ہوئے۔ مولانا کے بعد شریمالی کا دور کافی کڑا گزرا، ریٹائرمنٹ کے بعد جامعہ ملیہ میں مکان بنالیا تھا۔ ایک بہن (صالحہ عابد حسین)، ایک بہنوئی (ڈاکٹر عابد حسین)، تین بیٹیاں (ڈاکٹر سیّدہ سیّدین کو ہندوستان میں سب جانتے ہیں) اور کئی درجن کتابیں اور خطبات یادگار چھوڑے ۱۹۷۱ء میں وفات پائی۔

جارج اس وقت یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔

☆☆☆

21

۱۸/اکتوبر۱۹۶۴ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبّ مکرم، تسلیم۔ میں ان دنوں علی گڑھ سے باہر رہا۔ واپس آیا تو آپ کا ۴/کا عنایت نامہ ملا۔ آپ کی کتاب کے بارے میں سیدین صاحب کو لکھ بھی چکا ہوں۔ اور یہاں ملاقات ہوئی تو زبانی بھی عرض معروض کر دیا تھا۔ ان کا جواب آیا کہ کشمیر کی منسٹری ذرا مستحکم ہو جائے تو سلسلہ جنبانی کی جائے۔ بہرحال آپ مطمئن رہیں جو کچھ ہو سکے گا وہ ضرور ہوتا رہے گا۔ آپ نے اپنی جس دوسری کتاب کا ذکر کیا ہے اسے ضرور شروع کر دیجئے۔ یہ کام بہت اچھا ہے اور اہم ہوگا۔ چھپنے چھپانے کا مرحلہ تو بعد میں آئے گا۔ انشاء اللہ اس وقت تک حالات کافی سازگار ہو چکیں گے۔ خاں صاحب سے عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں وہ ہر معقول کام میں حصہ لینے کو تیار رہتے ہیں۔

اچھا تو ہے آپ مستقل طور پر دہلی آ جائیں۔ مرکز میں رہنے سے آپ کو اور اہالیان مرکز دونوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ **علی گڑھ کے وہ تین سکھ طالب علم** جو آپ کو سری نگر میں ملے تھے اور اب برسرکار ہیں **علی گڑھ کو عزت اور محبت سے یاد کرتے تھے۔ یہ ان کی شرافت اور سعادت کی بھی دلیل ہے۔ اپنی درسگاہ سے محبت کرنا ویسا ہی ہے جیسا اپنی ماں سے محبت کرنا۔ ماں چاہے اونچے طبقے کی ہو چاہے نچلے طبقے کی۔** یہ محسوس کر کے خوش ہوتا ہوں کہ آپ حسب معمول خوش اور سرگرم عمل ہیں۔ باوجود اس احساس کے، کہ..... طبیعت ان دنوں اچھی نہیں ہے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

بولڈ/کالی سطریں، انشائے رشیدی کا پیارا نمونہ!

21-A

اتوار۔ یکم نومبر ۱۹۶۴ء

(Personal)

محبی سلام شوق۔ نوازش نامہ مورخہ ۲۸ر اکتوبر کل ۳۱ر کو صادر ہوا۔ آپ کے خط پر جموں کی مہر ۳۰ر کی لگی ہوئی ہے۔ یہ دو دنوں تک کہاں معلق رہا؟ میں وطن نہیں، حیدرآباد (دکن) ایک میٹنگ کے سلسلے میں گیا تھا۔ وطن کا کیا ذکر اب تو میں خود علی گڑھ میں (۱)

آپ پاکستان جانے کو کہتے ہیں۔ وہاں جانے میں پاسپورٹ اور ویزا وغیرہ بڑے جھگڑے ہیں۔ اب تو وہاں جانا ہے جہاں اس طرح کی قید نہیں اور سفر جبری اور مفت، جس کا پاسپورٹ عرصے سے رکھا ہے ویزا کا انتظار ہے۔

مجوزہ کتاب بالضرور لکھئے، کام بہت اچھا ہے، چاہے شائع ہو سکے یا نہیں اس کے لئے کب ایسے مواقع نکل آئیں کہ طباعت، اشاعت اور (۲) وغیرہ سب مہیا ہو جائیں۔ اچھا کام ہو تو اچھی توقعات بھی رکھنا چاہیے۔

پروفیسر عبدالمجید قریشی سے جو یہاں Maths کے چیرمین تھے اور اب پاکستان میں ہیں، خوشی محمد ناظر کے پسماندگان کا پتہ چل سکتا ہے، ضرورت ہو تو مطلع فرمائے گا۔ قریشی صاحب سے Contact کرونگا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

(۱) پڑھا نہیں جا سکا۔

(۲) خط جامعہ اردو کے کارڈ پر لکھا گیا ہے۔

22

۲۴/دسمبر۱۹۶۴ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبّ مکرم بھٹناگر صاحب، آداب

نوازش نامہ مورخہ ۲۲/دسمبر۶۴ء

گرمی کے موسم میں آپ خط کشمیر سے آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہاں کا موسم اور فضا ساتھ لایا ہو۔ اور آج کل سرما میں موصول ہوتا ہے تو اس کے جنوبی سواحل کا لطف آجاتا ہے۔ یہ سب آپ کے لطف و کرم کا کرشمہ ہے۔

سید ین صاحب کو بھی میں نے لکھ دیا تھا کہ **صادق صاحب** کی توجہ آپ کی تصنیف کی طرف مائل کریں۔ کہہ پہلے چکا تھا لیکن شاید آپ کو اپنے اس اندیشے کی بھی اطلاع دے دی تھی کہ وہ کچھ نہ کریں گے تو مجھے تعجب نہ ہوگا۔ آپ مایوس نہ ہوں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ آپ کے خط سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ **بڑے لوگ صرف بڑے لوگوں کا کہا مانتے ہیں اس لیے کہ ان سے معاوضے کی توقع رہتی ہے۔ بڑے لوگ چھوٹوں سے صرف خدمت کے متوقع ہوتے ہیں۔ آپ کی دعا اور شکر گزاری کی ان کو محتاجی نہیں ہوتی، اس اصول کو یاد رکھیے۔**

آپ کی چھٹی اور تبادلے کے انتظامات کا پروگرام معلوم ہوا۔ دعا ہے کہ سب کچھ آپ کی مرضی اور آپ کی صلاح و فلاح کے مطابق طے پائے۔

یہ معلوم کر کے خوش ہوا کہ بالآخر وہاں کے لوگ، گرد و پیش اور لیل و نہار آپ کو پسند آنے لگے۔ مبارک ہو۔

خاں صاحب اچھے ہیں اکثر آپ کا ذکر رہتا ہے۔ دعا ہے آپ کی تصنیف کی طباعت و اشاعت کا معقول انتظام ہو جائے۔

آپ کا، رشید احمد صدیقی

صادق صاحب سے مراد غلام محمد صادق ہیں جو شیخ عبداللہ/غلام محمد بخشی کی کابینہ میں وزیر تعلیم رہے اور بالآخر کشمیر کے وزیر اعلیٰ بھی ہو گئے۔

☆☆☆

23

۶ رجنوری ۱۹۶۵ء

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم۔

آپ کا کارڈ صادر ہوا تھا جس میں آپ نے انگریزی نظم میں **پنڈت جی** کی وفات پر اپنے جذبات کا اظہار اور نئے سال کا خیر مقدم کیا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ حسب معمول بہت اچھی نظم تھی اور نہایت پاکیزہ جذبات۔

لیکن بھٹناگر صاحب، آپ خط کتابت میں کفایت شعاری کو کیوں اتنا دخل دیتے ہیں۔ سرکاری اور ذاتی دونوں حیثیتوں سے آپ بڑے ہی گھسے پسے، پھٹے پرانے ناصاف کاغذ اور لفافے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ معلوم نہیں کس عہد کا کس درجہ فرسودہ آپ کا ٹائپ رائٹر ہے جس کے نہ تو حروف سالم رہ گئے ہیں نہ ترتیب سے وہ ٹائپ ہوتے ہیں۔ سارا Alignment بگڑ گیا ہے۔ آپ کا ایک ذمہ دار معزز عہدہ ہے۔ ذی حیثیت لوگوں سے خط کتابت رہتی ہوگی اس لیے اس طرح کے Shabby کاغذ لفافے اور از کار رفتہ ٹائپ رائٹر نہ استعمال کیا کیجیے۔ اس سے آپ کے عہدے کی اور جو کچھ آپ لکھتے ہیں اس کی وقعت گھٹتی ہے اور تحریر بے اثر رہ جاتی ہے۔ آپ کے خطوط ڈاک کے دوسرے کاغذات میں اکثر اس لیے نظر انداز ہو گئے کہ ذہن نے ان کا ظاہر دیکھ کر یہ سمجھا کہ خط نہیں معمولی درجے کا کوئی پمفلٹ یا اس کا wrapper ہوگا۔ اسٹیشنری قیمتی اور پر تکلف نہ ہو نہ سہی decent ضرور ہونا چاہیے۔ مناسب قسم کی اسٹیشنری سرکار سے نہ ملتی ہو تو اپنی ذاتی اسٹیشنری اپنے دام سے خریدیئے اور خط کتابت کے لیے اس کو کام میں لایئے سرکاری نہیں تو ذاتی حلقے کے لیے۔

خاں صاحب اچھے ہیں۔ موسم اعتدال پر ہے۔ آپ کے جاننے پہچاننے اور آپ کو عزیز رکھنے والے سب بخیریت ہیں اور اکثر آپ کا ذکر خیر کرتے ہیں۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

☆☆☆

پنڈت جی سے مراد جواہر لال نہرو، جن کی وفات ۲۷ رمئی ۱۹۶۴ء کو ہوئی تھی۔

24

۲۰ رفروری ۱۹۶۵ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبی، تسلیم۔

گرامی نامہ صادر ہوا تھا۔ بڑی خوشی ہے کہ آپ نے میرا کہا مان لیا اور بہتر اسٹیشنری استعمال کرنا گوارا فرمانے لگے۔ آپ نے تہنیت بھیج کر میری توقیر بڑھائی اور دل خوش کیا۔ شکریہ۔

آپ کی تصنیف آج کل کس منزل میں ہے۔ معلوم نہیں کیسا ''اشٹ گرہ'' ہے جو دور ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اس بارے میں کہیں سے کوئی خوش خبری ملی؟ اکابر کشمیر سے کوئی ادھر آتا تو کتاب کے بارے میں سلسلہ جنبانی کی جاتی۔ آپ دہلی کب تک آ رہے ہیں؟

کچھ دنوں سے کشمیر کی سرد ہواؤں نے یہاں دسمبر اور جنوری کا لطف پیدا کر رکھا ہے۔

خدا کرے آپ سب خوش و تندرست ہوں۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

☆☆☆

25

منگل ۶/اپریل ۱۹۶۵ء
ذکااللہ روڈ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبی، سلام شوق۔ یکم کا عنایت نامہ کل شام موصول ہوا۔ آپ نے نئے وائس چانسلر صاحب کو کتاب کے بارے میں لکھا، اچھا کیا۔ خیال رکھوں گا کہ اس کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ موصوف اگر متعلقہ لوگوں سے دریافت حال فرمائیں گے تو ظاہر ہے ہر شخص آپ کی اس خدمت کے بارے کلمہ خیر ہی کہے گا۔

ایم.ایم. بیگ صاحب کے بارے میں جو آپ نے لکھا ہے کہ وہ علی گڑھ یا مجھ سے واقف نہیں ہیں یا انھوں نے واضح طور پر یہی impression دیا، بڑی حیرت کی بات ہے مجھے اس کا انتظار تھا کہ آپ کا خط آئے تو مرزا صاحب کو آپ کے بارے میں مفصل خط لکھوں۔ ان کی مدد سے سب کام بن جائے گا لیکن یہ معلوم کر کے کہ وہ علی گڑھ سے اس درجہ الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں، بڑی مایوسی ہوئی۔ ٹھیک کہا ہے کسی نے: ''انقلابات ہیں زمانے کے''

طارق صاحب سے بالکل واقف نہیں ہوں۔ کتاب کے سلسلے میں اخراجات کا تخمینہ پہلے سے معلوم ہے۔ لیکن کہیں گنجائش تو نکلے! اللہ مدد کرے گا۔

آپ کے جاننے پہچاننے والے سب بفضلہٖ بخیر ہیں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

ایم ایم بیگ سے مراد مرزا محمود بیگ ہیں جو آزادی کے بعد دہلی والوں اور دہلی میں تعلیم کے پھیلاؤ کے سلسلے میں مسیحا کا درجہ رکھتے تھے ۶۵ء کے آس پاس وہ کشمیر میں تعلیمات یا یونیورسٹی سے وابستہ رہے تھے۔

طارق صاحب ۶۵ء کے آس پاس سرکاررس کشمیریوں میں شمار ہوتے تھے، شاید کچھ دن منسٹر بھی رہے۔

☆☆☆

26

۱۷/اپریل ۱۹۶۵ء
ذکااللہ روڈ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، آداب

عید کی تہنیت کی آپ کی انگریزی نظم اور کارڈ کا گلے ملنے کا ڈیزائن (دونوں نہایت پاکیزہ اور خوبصورت) مجھے موصول ہوئے۔ اس مہنگائی میں ایسے دوفربہ دوست یاد نبے کہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مسز بھٹناگر کے ذوق (Good taste) اور ستم ظریفی (Irony) دونوں کی داد دیتا ہوں۔ آپ کی نظم میں مروت و محبت کی کتنی دل آویز تصویر ملتی ہے۔ خدا ان خوبیوں سے ہمیشہ آپ کو شادکام رکھے۔ آمین

موسم یہاں کا اب نا ملائم ہونے لگا ہے۔ اس اعتبار سے کشمیر کا خوشگوار ہو رہا ہوگا۔ دعا ہے کہ وہاں کی سیاسی اور سماجی فضا بھی اعتدال پر آجائے۔ کیسا دلکش دیار کس عذاب میں مبتلا ہے!!

امید ہے آپ خوش وخرم ہوں گے۔ Scissors & Paste کا اتنا خوبصورت ڈیزائن کم دیکھنے میں آیا تھا۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

☆☆☆

27

۲۳/اپریل ۱۹۶۵ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مجی، تسلیم

گرامی نامہ ملا۔ **یوسف صاحب** ان دنوں علی گڑھ میں نہیں ہیں۔ واپس تشریف لانے پر گفتگو ہو سکے گی۔ ظاہر ہے وکالت کرنے میں میں یا خاں صاحب کوئی بھی دریغ نہ کرے گا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

ڈاکٹر **یوسف حسین خاں** صاحب، ان دنوں پرووائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے عہدے پر فائز تھے۔ یہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے چھوٹے بھائی تھے۔ متعدد تاریخی اور ادبی کتابوں کے مصنف ہیں جنمیں ''روح اقبال'' اور ''اردو غزل'' زیادہ مشہور ہوئیں۔

☆☆☆

28

۱۵رمئی ۱۹۶۵ء

ذکااللہ روڈ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم۔

عنایت نامہ ملا۔ اردو کے سب سے مقبول عام شاعر نظیر اکبرآبادی نے دعا مانگی ہے:

ع اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست!

دوسری طرف اردو کے سب سے بڑے شاعر غالب نے کہا ہے :

تنگ دستی اگر نہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

آپ کو آبرو نصیب ہے اور آپ کی تندرستی تنگدستی سے محفوظ ہے تو پھر آپ کے لیے اس **خدا سے کیا مانگوں جس کے وجود یا تصور کے آپ قائل نہیں**۔ بہرحال اپنے خدا اور آپ کے ناخدا سے چاہتا ہوں کہ وہ آپ میں اوپر کی گنائی نعمتوں کے ساتھ اس جذبۂ شرافت ومحبت کو بھی تازہ اور توانا رکھے جس کا اظہار آپ اکثر میرے لیے کیا کرتے ہیں۔ جس میں انسانیت ہوگی وہ اقرار کرے یا نہیں خدا سے باہر نہیں ہوتا۔ خدا کا تصور مختلف .....انکار محض کا بھی ہوسکتا ہے لیکن انسانیت کا تو یکساں ہوگا اور انسانیت کا سرچشمہ وہ اعلیٰ ترین اقدار (Values) ہیں جسے وسیع ترین مفہوم میں خدا کہتے ہیں۔ بھٹناگر صاحب میری اتنی بات یاد رکھیے گا، خدا کا تصور دور جہالت کا تصور نہیں ہے، یہ اعلیٰ اور اشرف ذہنوں اور اسی طرح کی وجدانی صلاحیتوں کا

خلاصہ ہے —

بات کیا تھی قصہ کیا چھڑ گیا۔

علی گڑھ کے حادثے نے طبیعت کو بہت بے قرارا اور بے بس کر رکھا ہے۔ نہ یہ معلوم کہ کیا ہوگا، نہ اس پر قدرت کہ کیا کروں۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ صاحب اولاد ہونا کتنی بڑی آزمائش ہے۔ یہ سارے سر پھرے طالب علم اپنی اولاد معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو اولاد سمجھوں، یونیورسٹی کو ماں جانوں۔ مسلمان جس حال میں ہیں ان کا خیال کرتا ہوں تو کیا بتاؤں کیا حالت ہوتی ہے۔ اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے رسول ہم گناہگاروں کے لیے قیامت کے دن کس درجہ بے قرار ہو ہو کر خدا سے بخشائش کی دعا مانگتے ہوں گے۔

لیجئے کارڈ ختم ہو گیا اور کتنی باتیں کہنے سے رہ گئیں۔ جارج صاحب ایک ماہ کی رخصت پر وطن گئے۔ آپ کے لکچروں کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا رہوں گا۔ بقیہ پھر۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

خدا کے وجود یا تصور کے بھٹنا گر صاحب قائل نہیں تھے، رشید صاحب مختلف خطوں میں خدا پرست بنانے کی کوشش میں مشغول رہے۔ کہاں تک کامیابی ہوئی یہ وہ جانتے ہوں گے یا بھٹنا گر صاحب! لیکن ہمیں سود میں بڑے ایک خدا پرست دانش ور کی چند خوبصورت تحریریں میسر آ گئیں جن میں سے ایک یہی پیش نظر خط کا یہ پیراگراف بھی ہے۔

علی گڑھ حادثے سے مراد ۲۵/اپریل کا حادثہ ہے جو یونین بلڈنگ میں کورٹ کی میٹنگ میں علی گڑھ پر گزرا، جب بیٹوں پر باپ پر ہاتھ اٹھایا۔ علی یاور جنگ تازہ وائس چانسلر ہو کر آئے تھے اور انٹرمل طلبہ کے لئے ریزرویشن کی تعداد کے گھٹانے بڑھانے پر ان کے اور طلبہ کے درمیان بدمزگی ہوگئی جس کا انجام اس حادثے پر ہوا۔ جس کے نتیجے میں علی گڑھ کا 2+ معطل کر دیا گیا اور مدت تک سرکار اور یونیورسٹی کے اولڈ بوائز کے درمیان سرکشی چلتی رہی۔

29

۲۵؍مئی ۱۹۶۵ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، آداب

کل دہلی سے سیدین صاحب کا خط آیا۔ آپ سے متعلق یہ اطلاع دی ہے:

''میں کل ایک ماہ کے لیے سری نگر جا رہا ہوں .....بھٹناگر صاحب کے بارے میں جو یادداشت آپ نے دی تھی اپنے ساتھ لے جارہا ہوں۔شاید صادق صاحب سے گفتگو کا موقع نکل سکے۔''

سیدین صاحب کا پتہ C / o مرزا محمود بیگ صاحب ایجوکیشنل ایڈوائزر، حکومت کشمیر ہے۔ میں سیدین صاحب کو خط لکھوں گا تو آپ کا ذکر ایک بار اور کردوں گا۔ موقع ملے تو آپ بھی مل لیجئے گا۔

یہ کارڈ محض اطلاع کے طور پر بھیج رہا ہوں۔ ورنہ کوئی اور بات ایسی نہ تھی جس کے بارے میں (اور) گفتگو کرتا، سوا اس کے کہ خیریت سے ہوں اور آپ کی جان پہچان کے دوسرے لوگ بھی بخیر ہیں۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

30

۳۰؍جون ۱۹۶۵ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، آداب

۲۵ جون کا عنایت نامہ کل موصول ہوا۔ آپ نے ساری باتیں بڑی تفصیل سے اور بڑے دلچسپ انداز میں لکھی ہیں۔ لطف آ گیا۔ میں تو یہی نتیجہ نکالتا ہوں کہ آپ کی کتاب کے چھپنے کا امکان بہت قوی ہو گیا ہے۔

اس کی بھی کچھ کم خوشی نہیں ہے کہ حکام اعلیٰ آپ کے کام سے اتنے خوش ہیں اور آپ پر اتنا اعتقاد کرتے ہیں کہ آپ کی مفارقت گوارا نہیں کر سکتے۔ اس امتیاز پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔

اس طرف موسم کے شدائد عروج پر ہیں۔ آپ کو عزیز رکھنے والے یہاں بفضلہٖ سب بخیر ہیں۔ اب کچھ دن معاملات کو جوں کا توں چلنے دیجئے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔

دعا گو
رشید احمد صدیقی

☆☆☆

31

۱۹/جولائی ۱۹۶۵ء

ذکااللہ روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

آپ کا مفصل خط ملا اور بعض خطوط کی نقلیں بھی۔ آپ کو دوست رکھنے والے اور آپ کی تصنیف کے قدر دران وہ سب کچھ کریں گے جو ان سے بن پڑے گا۔ اس کا تو آپ کو یقین ہوگا۔ لیکن اسکے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بات اسی کی مانی جاتی ہے جس سے مانگنے والے کی دور یا نزدیک کی کوئی غرض وابستہ ہو۔ ہم ایسوں سے کس کی غرض وابستہ ہوسکتی ہے کہ وہ ہمارا کہا مانے گا۔ آپ نے تو دیکھا کہ اچھے اور لکھے پڑھے لوگوں نے آپ کی تصنیف کے لیے کتنے اور کیسے کیسے آستانوں پر حاضری دی لیکن کچھ نہ ہوا۔

یاد آتا ہے کئی سال گزرے، ایشیا پبلشنگ نے آپ کی کتاب کی طباعت کا تخمینہ چھ سات ہزار کا بتایا تھا۔ اب سولہ سترہ ہزار کیسے ہو گئے؟

یونیورسٹی کی بساط اور چہرے سب بدل چکے ہیں، میں یا۔ جن کے نام آپ نے لکھے ہیں ان میں بیشتر نہ پہلے کوئی حیثیت رکھتے تھے نہ اب۔ یہی نہیں کہ کسی بارگاہ میں رسائی نہیں بلکہ ہر بارگاہ میں مردود! پھر کام کیسے بنے! یونیورسٹی کا اس اچھے کام کے لیے آٹھ نو ہزار روپئے منظور کر دینا معمولی سی بات ہے۔ لیکن بھید وہی ہے یعنی آپ اور میں دونوں **nondercript جس کا سیکولرڈیما کریٹک ترجمہ پھٹیچر ہوسکتا ہے** کون بے وقوف ایسوں کی طرف التفات کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے توسیعی لکچروں (Extension Lectures) کا انتظام ہوجائے تو معاملے کے روبراہ ہونے کا امکان زیادہ قوی ہوجائے گا۔ اس کی کوشش کروں گا۔

سید محمود صاحب نے آپ کے خطوط کا جواب نہیں دیا ہے اس سے آپ آزردہ یا بدگمان نہ ہوں۔ وہ آپ اور آپ کی کتاب دونوں کے قدر دان ہیں۔ کتنی معذوریوں کے باوجود بے شمار گتھیوں کے سلجھانے میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ترس آتا ہے اور ان

کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔

سیدین صاحب نے اپنا وعدہ پورا کیا اور صادق صاحب سے آپ کی تصنیف کے بارے (میں) کلمات خیر کہے، جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ جلد ہی یہاں تشریف لانے والے ہیں۔ ملاقات ہوگی تو آپ کا تذکرہ کروں گا۔ زیدی صاحب سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ موصوف سے آپ ہی خط و کتابت کرتے رہیں تو بہتر ہوگا اور ایسا ضرور کرتے رہیے اس لیے کہ عام خیال یہ ہے کہ **اس وقت وہ نئے وائس چانسلر** صاحب کے سب سے معتبر و موثر صلاح کار ہیں۔

آپ نے پونچھ (Poonhch) کے ''آزاد گاؤں'' کا ذکر خوب کیا ہے۔ یعنی اس کا امتیاز یہ ہے کہ یہاں شراب آزادی سے بنتی، بکتی اور پی جاتی ہے اور اسمگل کی جاتی ہے۔ آزاد گاؤں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ شعرا نے کشمیر کو جنت نظیر بتایا ہے۔ لیکن اب تک یہ جنت Locate نہیں ہوئی تھی۔ تقسیم ملک نہیں تو تقسیم کشمیر کے بعد وہ بھی ہوگئی۔

کل سے مانسون کی توجہ پہلی بار علی گڑھ کی طرف ہوئی ہے۔ طبیعت اچھی نہیں ہے، جسمانی اور ذہنی دونوں اعتبار سے۔ اخلاقی محاذ تھوڑا بہت ساتھ دے رہا ہے، جس محاذ کی ساری عمر توڑ پھوڑ کرتا رہا۔ ٹریجڈی یا ستم ظریفی یہ ہے کہ اب اسی کا سہارا پکڑنا چاہتا ہوں۔ **خاں** صاحب اور **شروانی** صاحب خیریت سے ہیں۔ شروانی صاحب سے ملاقات کم خط و کتابت اکثر ہو جاتی ہے۔ خدا حافظ۔ دعا ہے کہ آپ خوش اور تندرست ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

بساط سے مراد نئے وائس چانسلر علی یاور جنگ کا عہد ہے جس میں رشید صاحب کے معتقد دوست یوسف حسین خان پرو وائس چانسلر شپ سے مستعفی ہو کر دہلی جا چکے ہیں۔

کالی عبارت توجہ طلب رشید صاحب نے یہاں انگریزی کا مزے دار ترجمہ کیا ہے۔

نئے وائس چانسلر سے مراد علی یاور جنگ ہیں اور زیدی صاحب اسلئے معتبر بتائے گئے ہیں کہ ڈاکٹر یوسف حسین خان جا چکے ہیں۔ کہ علی یاور جنگ حادثے میں وہ بھی مخالف گروپ میں شمار کئے گئے تھے۔ زیدی صاحب کے عہد میں پرو وائس چانسلر مقرر ہوئے تھے، اور زیدی صاحب سے بھی اچھے تعلقات نہیں رہے تھے۔

خان سے مراد پروفیسر حمید الدین خاں صاحب، اور **شروانی** صاحب سے مراد مقتدی خاں شیروانی صاحب۔ پہلے بھی دونوں مذکور ہوئے۔

☆☆☆

32

۲۳/جولائی ۱۹۶۵ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

کل آپ کا خط ملا جس میں تاریخ نہیں لکھی تھی۔ اتفاق سے سیدین صاحب بھی تشریف رکھتے تھے، گو آپ کا ذکر پہلے ہی کر چکے تھے۔ مجھے امید ہے سیدین صاحب آپ کے لیے وہ سب کریں گے جو کر سکتے ہیں۔ آپ نے اپنی کتاب کے جو اجزا ان کو پڑھنے کے لیے دیے تھے وہ ان کو پسند آئے۔

آپ نے وائس چانسلر صاحب کو تو تحریر بھیجی ہے؛ دیکھیے موصوف اس پر کیا کاروائی کرتے ہیں۔ آپ کے پبلشرس کتاب کے دام کیا رکھیں گے؟ ایشیا پبلشنگ اپنی کتابوں کے دام زیادہ رکھتا ہے۔ یونیورسٹی پانسو نسخے خریدے گی یا نہیں اس کا بہت کچھ مدار اس پر بھی ہے کہ پبلشرس کتاب کے دام کیا مقرر کرتے ہیں۔

مجھے اس کی فکر ہے کہ کسی طرح آپ کے توسیعی لکچروں کا یہاں انتظام ہو جائے۔ یہ آپ کا اور آپ کی تصنیف کا بڑا موثر اشتہار ہوگا۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ جن صاحب کے ہاتھ میں اس طرح کے لکچروں کا کاروبار ہے ان سے عرض معروض نہیں کرنا چاہتا، مگر کوشاں رہوں گا۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

☆☆☆

33

۱۰/اگست ۱۹۶۵ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب محترم، تسلیم

۷/کا نوازش نامہ کل ملا۔ کیا بتاؤں آپ کی تصنیف کس آسیب کی زد میں ہے۔ کوئی اچھی خبر ہو، اس کے ساتھ ایک دشواری یا خطرہ بھی ضرور متعلق ہوگا۔ جارج (Mr.George) یہیں ہیں اور بہت مصروف۔ ان دنوں وہ نئے وائس چانسلر صاحب سے بہت سے دوسروں سے زیادہ قریب ہیں۔ کن دو ریفریز کو کتاب دکھائی جائے گی۔ کچھ ذہن میں نہیں آتا۔ ظاہر ہے وہ لوگ شاید نہ ہوں جو اپنی رائے بہت پہلے دے چکے ہیں۔

بہر حال اپنی طرف سے اپنی خلوص نیت پر اور میری طرف سے میرے خدا پر بھروسہ رکھیے۔ انجام بہر حال بخیر ہوگا۔ مسٹر جارج سے برابر Contact رکھیے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

کالی عبارت ایک بار پھر ملاحظہ ہو، رشید صاحب کی انشاء کے لئے۔

☆☆☆

34

۲۳/اکتوبر ۱۹۶۵ء سنیچر
یونیورسٹی، علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

کل شاید آپ کا ایک کارڈ **کمال** کے نام آیا کہ آپ کے متعدد خطوط کا جواب میں نے نہیں دیا۔ اس لیے آپ میری طرف سے فکرمند ہیں۔ تقریباً نوے فیصدی خطوط کا جواب یہی ہمروزہ دیتا ہوں ورنہ دوسرے تیسرے دن بالضرور!

آپ کے دو عنایت نامے ملے، ایک کا جواب تو حسب معمول اسی دن دے دیا۔ دوسرا جس میں آپ نے پاؤں کے حادثہ کا ذکر کیا تھا اسی کا جواب غالباً تیسرے دن دے سکا۔ تعجب ہے یہ خطوط کیوں نہیں ملے۔ اس وقت کچھ اس طرح کا وسوسہ پیدا ہو رہا ہے کہ پتے پر جموں کے ساتھ سری نگر تو نہیں لکھ گیا تھا، اس لیے خطوط ادھر اُدھر ہو گئے ہوں۔ لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ اس طرح کی غلطی پہلے بھی ضرور ہوئی ہوگی، لیکن خطوط آپ کو ملتے رہے۔

بہر حال جو ہوا سو ہوا۔ آپ کو میری طرف سے تردد رہا، اس محبت کا شکر گزار ہوں۔ آپ کی **چوٹ** کا کیا حال ہے۔ کمال کے خط میں کچھ تو اشارہ کر دیا ہوتا۔ لیکن خدا کے فضل سے یہی امید ہے کہ تکلیف زائل ہو چکی ہوگی اور آپ زندگی کے معمولات میں حسب معمول غیر معمولی حد تک مصروف ہوں گے۔ یہ سب سے بڑی خوش خبری ہے جس کا متوقع ہوں۔ امید ہے دوسرے خط میں یہی آپ سے ملے گی۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

کمال صاحب: رشید صاحب کے بھانجے۔ یونیورسٹی کی سروس میں تھے۔ رشید صاحب کی مدت العمر ان کی کے ساتھ ہی قیام رہا۔

ایک حادثے میں بھٹناگر صاحب کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

☆☆☆

35

۴؍نومبر ۱۹۶۵ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

آپ کو میری خیریت مل گئی یا نہیں؟ نہ ملی ہو تو اپنی خیریت سے مطلع فرمایئے۔ آپ کو عزیز رکھنے والے سب یہاں **بقید حیات بھی ہیں اور بقید حواس بھی۔**

آپ کا
رشید احمد صدیقی

حیات بھی حواس بھی! لطف اٹھایئے

☆☆☆

36

۲۹ر دسمبر ۱۹۶۵ء

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم۔ سال نو کے مبارک ہونے کی آپ کی دعا جس کو میں اپنے لیے خوش خبری سمجھتا ہوں موصول ہوئی۔ شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے عزیزوں اور دوستوں کو خوش رکھے، سال آئندہ ہی نہیں، بلکہ سالہا سال۔ خدا کے یہاں سال کا شمار نہیں بلکہ نہ ختم ہونے والے تسلسل کا ہے۔

جیلانی صاحب اکثر صبح ٹہلنے میں خاں صاحب کو مل جاتے ہیں۔ جیلانی صاحب کا کہنا ہے کہ میری خیریت کی خبر آپ کو نومبر سے نہیں ملی۔ بڑا تعجب ہے اس لیے کہ میں نے آپ کے ہر خط کا جواب ہمروزہ ہی نہیں بلکہ فی الفور دیا۔ بہرحال اب جب کہ آپ **جے پور** آ گئے ہیں امید ہے میرا یہ خط ضرور ملے گا۔ آپ کے پاؤں کا کیا حال ہے۔ کب تک کی چھٹی ہے، علی گڑھ بھی آنا ہوگا؟ کتاب کا کیا رہا۔ جموں سے کہیں اور تبادلے کا امکان یا خواہش ہے؟

مجھے تو کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ شاید **بخشی صاحب** پھر برسرکار آ جائیں۔ ایسا ہوا تو جامعہ اردو اور آپ کی کتاب دونوں کے دن پھریں گے۔ بخشی صاحب نے جامعہ کو بہت کچھ دیا۔ اتنی بڑی امداد ایسے چھوٹے اور گمنام سے ادارے کو شاید ہی کسی اور سے آئندہ کبھی ملے۔

امید ہے آپ جے پور میں آرام سے خوش و خرم ہوں گے۔ آپ کی یہ انگریزی نظم حسب معمول بہت اچھی اور بڑی اثر انگیز۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

جیلانی صاحب سے مراد راقمہ کے والد صاحب مرحوم مغفور، جو صبح کو ٹہلنے ضرور جایا کرتے تھے اور اس وقت حمید الدین خاں صاحب (جن کا اس خط میں ذکر ہے) اور بعض دوسرے احباب سے ان کی ملاقات ہو جاتی تھی۔

جے پور میں غالباً گھر بنا لیا تھا۔ اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی آخری زمانہ بھی وہیں گزرا۔ یہ غالباً ان کا سسرالی وطن تھا۔

بخشی صاحب سے مراد بخشی غلام محمد جو شیخ عبداللہ کے بعد، بلکہ انہیں ہٹا کر کشمیر کے چیف منسٹر ہو گئے تھے۔ پھر انہیں بھی ہٹایا گیا اور غلام محمد صادق چیف منسٹر ہوئے۔ صادق صاحب کے بعد غالباً انکے دوبارہ واپس ہونے کی امیدیں بندھنے لگی تھیں۔ ☆☆☆

37

۸/جنوری ۱۹۶۶ء
وقت ۹ بجے رات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹنا گر صاحب مکرم، تسلیم

آپ کی کتاب کل **جعفری صاحب** کے یہاں پہنچا دی تھی۔ آج دوپہر وہ بمبئی واپس جانے کے لیے دہلی گئے اور یہ فرما گئے۔

"تفصیل سے پڑھنے کا وقت نہیں تھا۔ ادھر اُدھر سرسری نظر ڈالی ہے۔ اگر بھٹنا گر اس کی ایک جلد مجھے پڑھنے کے لیے بھیج دیں تو عنایت ہوگی۔ میں دیکھ کر واپس کر دوں گا۔ ممکن ہے میرے حلقۂ احباب میں کچھ اور لوگ بھی اسے دیکھنا چاہیں۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑے گا کروں گا۔ کتاب ضرور شائع ہونا چاہیے۔ آپ (رشید احمد کے) اور حبیب صاحب کے تبصرے کے علاوہ صادق صاحب اور ایشیا پبلشرز کے خطوط کی نقل بھٹنا گر صاحب سے لے کر میرے پاس بھجوا دیجئے۔ اس کے بعد میں ایشیا پبلشرز سے بات کروں گا۔ کتاب پڑھنے کے بعد اپنی تجویز لکھوں گا"۔

میں نے جعفری صاحب سے اس گفتگو کا خلاصہ بھی کہہ دیا جو کتاب کے سلسلے میں آپ نے حبیب صاحب سے کی تھی۔

جعفری صاحب کا بمبئی کا پتہ یہ ہے:

Syed Ali Sardar Jafari

Hindustani Book Trust
20, Khatan Bhawan
J. Jate Road
Bombay-1

آپ کی کتاب آپ کے بھتیجے صاحب کے سپرد کردوں گا، ساتھ ہی یہ خط بھی۔ مزید معلومات کے لیے آپ براہ راست جعفری صاحب[1] سے خط و کتابت فرمائیں اور جو چیزیں انھوں نے طلب فرمائی ہیں وہ مہیا کردیں۔

خاں صاحب[2] کو مسلم یونیورسٹی پر اپنا وہ مضمون بھیجئے جو آپ نے مختلف بڑے اصحاب کی خدمت میں بھیجے اور جس کا تذکرہ اس رات کو آپ نے خاں صاحب سے بھی کیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ کتاب سے متعلق ضروری باتیں میں نے عرض کردیں۔ بقیہ خط و کتابت سے!

مخلص
رشید احمد صدیقی

[1] **جعفری صاحب** مراد ہیں مشہور شاعر سردار جعفری، جو رشید صاحب سے شاگرد بھی تھے۔
[2] خاں صاحب سے مراد حمید الدین خاں صاحب۔

☆☆☆

38

۱۵؍فروری۱۹۶۶ء
ذکاءاللہ روڈ،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم،تسلیم

۱۲؍کا نوازش نامہ کل ملا۔ پچھلے سال آپ کو حادثہ پیش آیا،اس سال آپ کے آفس کو۔کشمیرخود ایک طویل حادثہ بنا ہوا ہے،اللہ رحم کرے۔

آشفتہ بیانی کا کوئی نیا ایڈیشن شائع نہیں ہوا ہے۔اطلاعاً عرض ہے۔

اس خبر کے سننے سے بڑی خوشی ہوئی کہ سرسید پر آپ کا لکچر کشمیر یونیورسٹی میں ہونے والا ہے۔کاش اس کا موقع اپنی یونیورسٹی میں کھلتا۔اس کو میں آپ کا نہیں اپنا کارنامہ سمجھتا۔خاں صاحب سے آپ کا ذکر کروں گا۔یہ بھی عرض کردوں گا کہ آپ نے یونیورسٹی پر جو مضمون لکھا ہے اس کی نقل موصوف کو جلد مل جائے گی۔

لکھیے گا بمبئی سے جعفری صاحب نے آپ کو کیا لکھا۔خط کتابت کا راستہ کھل جائے تو ایک خط احسان کو لکھ دیجئے گا۔ وہ مطلوبہ کتابوں کے بارے میں آپ کو مفصل اطلاع دیں گے۔

ہم سب زندہ ہیں۔دعا ہے کہ آپ خوش وخرم بھی ہوں۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

آشفتہ بیانی سے مراد ہے رشید صاحب کی کتاب آشفتہ بیانی میری!

☆☆☆

39

اتوار

۳/اپریل ۱۹۶۶ء،

ذکاءاللہ روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم ومحترم، آداب

مبارک باد کا محبت نامہ صادر ہوا۔ تیوہاروں کی خوشی اب بہت کم محسوس ہوتی ہے، البتہ ایسے موقعوں پر عزیزوں اور دوستوں کا یاد کر لینا تسکین کا باعث ہوتا ہے، جیسے اب بھی مرا کوئی مصرف باقی رہ گیا ہو۔ اللہ آپ کو خوش رکھے اور اپنی خوبیوں کو اچھے سے اچھے کاموں پر صرف کرنے کی توفیق دے۔

آپ تو اللہ کے قائل نہیں ہیں لیکن میرا عقیدہ یہ ہے کہ اپنے یا کسی اور کے لیے کچھ مانگے تو اسی سے مانگے جس سے مانگنے میں اپنی تسکین کا نہیں بلکہ بلندی کا احساس ہو۔ کتاب کے سلسلے میں اس کا احساس آپ کو ہوا ہوگا۔

آپ کی کتاب کی طباعت کے لیے جو کچھ بن پڑتا ہے کرتا رہتا ہوں:

ع ادھر سے کاش کوئی صاحب کرم گزرے!

مخلص

رشید احمد صدیقی

پورا خط ہی اہم ہے پہلا حصہ رشید صاحب کے اس زمانے کے حالات کا آئینہ ہے تو دوسرا حصہ ان کی انشائے جلیل کا نمونہ!

☆☆☆

40

۷/اپریل ۱۹۶۶ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

نوازش نامہ معلوم نہیں کب کا لکھا ہوا یا چلا ہوا مجھے ملا۔ آپ کی عید کی تہنیت کا جواب اس سے پہلے دے چکا ہوں جس میں عرض کیا تھا کہ آپ کی کتاب کی طباعت کے بارے میں جو کچھ ہوسکتا ہے کرتا رہتا ہوں، لیکن اب کچھ ایسی حالت کو پہنچ گیا ہوں کہ ایک پیش نہیں جاتی۔ **کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے کسی طرح اگر مجھے خدائی بھی سپرد کر دی جائے جب بھی کچھ نہ کر پاؤں۔** کچھ دنوں سے طبیعت خراب رہنے لگی ہے۔ اس کا اثر کام اور کارکردگی پر بھی پڑ رہا ہے۔ لیکن **ناگزیر کا ماتم عبث ہے۔ زندگی کا Finale زندگی کا بڑا اہم جز ہوتا ہے۔ جس سے سب کو گذرنا پڑتا ہے۔**

مہینے سوا مہینے سے سیدین صاحب پڑوس میں صاحب فراش ہیں۔ ۲۷/فروری کو کنووکیشن میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ قلب کا دورہ پڑ گیا۔ خدا کے فضل سے اب اچھے ہیں۔ آٹھ دس دن بعد دہلی واپس جائیں گے۔ ان کے ہمراہ ڈاکٹر **عابد حسین** بھی تشریف فرما ہیں۔ انھوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ اپ کی تصنیف کے بارے میں وائس چانسلر صاحب سے ذکر فرمائیں گے، اور سفارش کریں گے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے اور:

ہوتا ہے وہی جو منظور خدا ہوتا ہے۔

احسان کا پتہ یہ ہے

Dr. E. R. Siddiqi

41-K, 42nd Street, Block 6

PECHS, Karachi 19

دعا ہے کہ آپ خوش وخرم ہوں ۔خاں صاحب اچھے ہیں، آپ کا ذکر اکثر رہتا ہے۔آپ کے لکچر پروگرام سے مطلع ہوا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

کالی ربولڈ عبارتیں، پہلے پیراگراف میں توجہ طلب ہیں۔

پڑوس سے مراد بھانجیوں صابرہ زیدی، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی کے مساکن۔

ڈاکٹر عابد حسین صاحب سے رشتہ یہ تھا کہ سیدین صاحب کی بہن مصداق فاطمہ صاحبہ المعروف بہ صالحہ عابد حسین ڈاکٹر صاحب کی بیگم تھیں۔ بیماری کے زمانے میں تیمارداری کے لئے بہن بہنوئی علی گڑھ میں ساتھ رہے ہوں گے۔

اصلاً یہ مصرعہ یوں ہے وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے!

☆☆☆

41

۳۰؍مئی ۱۹۶۶ء
ذکاءاللہ روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

یہ آپ کے ۱۷؍ کے خط کا دوسرا جواب ہے۔ پہلا اب سے بہت پہلے دے چکا ہوں۔ سردار جعفری صاحب کا خط آیا تھا، جواب وہ کچھ دیں، نتیجہ وہی ''کچھ نہیں'' ہے۔ وائس چانسلر صاحب سے آپ کو اور آپ کے دوستوں کو کہتے سنتے کم وبیش ایک سال ہو گیا لیکن گاڑی آگے نہ بڑھی۔ **واقعہ یہ ہے کہ جب تک دوسرے کا کام آپ سے نہ نکلتا ہو وہ آپ کا کام نہ کرے گا۔ اس لیے فی الحال شکر سے نہیں تو صبر سے ضرور کام لیجیے۔** کیا حرج اگر آپ ایک خط سید ین صاحب کو بطور یاد دہانی میرے حوالے سے لکھ دیں کہ وہ آپ کی کتاب کے بارے میں وائس چانسلر صاحب کو چند کلمۂ خیر لکھ دیں۔ پتہ یہ ہے:

Prof. Dr. K. G. Sayyadain
7C-1,Tilak Nagar
New Delhi

یہاں کے آپ کے ہمارے جاننے پہچاننے والے خیریت سے ہیں۔ نفیس احمد ترمذی صاحب سے میں بالکل واقف نہیں ہوں۔ دعا ہے کہ آپ خیریت سے اور خوش وخرم ہوں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

یہ خط جامعہ اردو کے کارڈ پر لکھا گیا۔ ان دنوں، بلکہ مدتوں رشید صاحب جامعہ کے چانسلر رہے، اور آخر میں یہ اعزاز ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے سپرد کر دیا۔

☆☆☆

42

۲/اگست ۱۹۶۶ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، آداب

امتحان کے کام سے حیدرآباد گیا تھا۔کل واپسی پر آپ کا ۲۷/کا عنایت نامہ ملا۔**خدا کے فضل سے اچھا ہوں** اور یہ معلوم کر کے اور اچھا ہو گیا کہ آپ خیریت سے ہیں اور حسب معمول چہ غم! یہ بہت بڑی نعمت ہے جو میرے عقیدے کے مطابق اللہ نے آپ کو بخشی ہے خدا پر اعتقاد ہو یا نہیں اس کی یا کسی کی دی ہوئی نعمت پر خوش اور شکر گزار ہونا لازماً انسانیت وشرافت ہے۔اچھی باتوں پر خوش اور شکر گزار ہونے سے بات خدا تک پہنچ جاتی ہے۔اور بڑی حد تک حق ادا ہو جاتا ہے۔اچھا آدمی خدا پر ایمان رکھے یا نہیں خدا اس سے **خوش ہوتا ہے**۔

سردار جعفری صاحب کے بارے میں عرصہ ہوا سنا تھا ہندوستان سے باہر جانے والے تھے۔اب تک وہ واپس آ گئے ہوں گے۔خط لکھتا ہوں جواب سے آپ کو مطلع کروں گا۔

کل یہاں اچھی بارش ہوئی اور ہوا بھی خوب چلی۔اس سے اندازہ ہوا کہ کشمیر کا کیا عالم ہوگا یا کیا رہا کرتا ہے، برسات ہی میں نہیں ہر موسم میں۔

کتاب کی طرف (سے) مایوس نہ ہو جیے۔اچھا کام دیر یا سویرا اپنا انعام ضرور لاتا ہے کیا حرج ایک خط یاد دہانی کا پروفیسر محمد حبیب صاحب کو لکھ دیجئے۔ان ہی کی رسائی وائس چانسلر صاحب تک ہے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

''**خدا کے فضل**''۔سے۔''**خوش ہوتا ہے**''۔تک کی کہ پیاری عبارت کو دوبارہ پڑھیے اور لطف اٹھائیے

☆☆☆

43

۲۱؍ستمبر ۱۹۶۶ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

بھٹنا گر صاحب مکرم، تسلیم

۱۸؍کا نوازش نامہ ابھی ابھی ملا۔ پڑھ کر ہنسی بھی آئی عبرت بھی ہوئی۔ حبشی پادری کے لطیفے کو آپ نے سردار جعفری صاحب پر خوب چپکایا۔ شاعر اور فنکار کا انتقام بھی معمولی نہیں ہوتا۔ لیکن سب سے زیادہ لطف تو اس جواب سے آیا جو مسودے سے متعلق آپ کو یونیورسٹی سے ملا! سبحان اللہ۔ لیکن بھٹنا گر صاحب آپ ہرگز ہرگز مایوس وملول نہ ہوں۔ آپ نے بہت اچھا اور بہت بڑا کام انجام دیا ہے۔ اس کا آپکو انعام مل کر رہے گا۔ کب اور کس شکل میں یہ سوا خدا کے کوئی اور نہیں جانتا۔ **آپ اللہ کے قائل نہیں لیکن مخلص دوستوں کے خدا سے منکر نہ ہوجیے۔**

۱۶؍کو دہلی گیا تھا صورت حال معلوم ہوتی تو **ذاکر صاحب** سے پھر درخواست کرتا کہ کچھ کرادیں باوجود اس کے کہ ایسا اکثر کرتا رہا ہوں۔ آپ اطمینان رکھیں جیسے ہی کوئی موقعہ نکلا اپنی جیسی کوشش کروں گا۔ اپنی ضعیفی کا ماتم ابھی نہ کیجئے۔ ضعیفی آپ سے ابھی بہت دور ہے۔ **ان کو دیکھیے جو ضعیفی کی حد سے نکل کر اب زندگی کے آخری (فائنل) حادثے کے منتظر ہیں۔**

خاں صاحب کو آپ کا سلام پہنچادوں گا۔

آپ کی تندرستی اور خوشحالی کا دعا گو
رشید احمد صدیقی

کالی؍بولڈ عبارتیں توجہ طلب!

اس خط میں بالآخر ذاکر صاحب بھی ان لوگوں میں آہی گئے جن جن سے بھٹنا گر صاحب کے سلسلے میں درخواست گزاری کی گئی۔

44

۱۶/نومبر ۱۹۶۶ء
ذکاءاللہ روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

آپ کی وداعیہ نظم موصول ہوئی ۔خوب ہے۔ یاد فرمائی کا شکر گزار ہوں۔ کچھ دن ہوئے سیدین صاحب اور ڈاکٹر عابد صاحب آ گئے۔ آپ اور آپ کی کتاب کا ذکر چھڑا، بلکہ سیدین صاحب ہی نے چھیڑا۔ میں نے بہت کچھ کہا، عابد صاحب نے بھی تائید کی۔ خود سیدین صاحب نے ہمدردی کا اظہار کیا اور اس سے اتفاق کیا کہ کتاب چھپنی چاہیے۔ یہ سلسلہ دیر تک قائم رہا۔ بالآخر گفتگو کی کشتی اسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی جس پر ہمیشہ یہ حادثہ گزرتا رہا ہے: یعنی دام کہاں سے آئیں! لیکن یہ کیا کم ہے کہ گفتگو کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح چلا ہی جاتا ہے۔ کیا معلوم کس دن یہ مہم سر ہو جائے۔

خاں صاحب، جیلانی صاحب اور شروانی صاحب سب خیریت سے ہیں اور خوش وخرم۔ دعا ہے کہ آپ ایسے ہی خوش وخرم ہوں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

آغاز میں صرف دو نام ہوتے تھے خاں صاحب (حمید الدین خاں، اور شروانی صاحب مقتدا خاں)؛ اب پچھلے چند خطوط سے جیلانی صاحب (سید حامد حسین جیلانی، راقمہ، ذکیہ جیلانی کے والد مرحوم ومغفور) کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے بھٹناگر صاحب کے احباب میں اس تثلیث کا، رشید صاحب سے بھی قریبی تعلق رہا۔

☆☆☆

45

۵/جنوری ۱۹۶۷ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، آداب

سال نو کی تہنیت پر آپ کی بڑی خوبصورت انگریزی نظم موصول ہوئی۔ شکرگزار ہوا اور خوش ہوں کہ آپ نے حسب معمول یاد رکھا۔ اللہ تعالیٰ سال نو آپ کے لیے ہر اعتبار سے مبارک فرمائے۔ کچھ اور نہ سہی تو آپ کی کتاب کی اعلیٰ طباعت اور اشاعت کا خاطر خواہ انتظام فرما دے۔ آمین۔

خاں صاحب اور شروانی صاحب اور جیلانی صاحب بفضلہٖ مع الخیر ہیں۔ اور آپ کو یاد کرتے ہیں۔ ان دنوں آپ ہی کے دیار کی ہوا آئی ہوئی ہے۔ کاش آپ نے اس سے بہتر زمانے کا انتخاب کیا ہوتا۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور ہم پر رحم فرمائے۔

اس نظم میں زمانے کا کیسا صحیح اور متحرک نقشہ آپ نے پیش کیا ہے!!

مخلص

رشید احمد صدیقی

بھٹناگر صاحب کی یہ نظم، ان خطوں کے اگلے ایڈیشن تک، امید ہے تلاش ہو جائے گی۔

☆☆☆

46

۲۳؍فروری ۱۹۶۷ء
ذکاءاللہ روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، آداب

۲۵؍جنوری اور ۱۲؍فروری کا خط آج صادر ہوا۔ آپ نے جو باتیں اپنے ریٹائر ہونے اور اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں لکھی ہیں وہ نئی نہیں ہیں۔ معمر ہونے اور ہوتے رہنے کے (بعد) یہی سب ہوتا ہے۔ **کیا کیجئے گا، زیادہ جینے کا تاوان ادا کرنا ہی پڑتا ہے۔** بے روزگاری کی طرف سے فکرمند نہ ہوجیئے، آپ کی خوبیوں کا آدمی کبھی کسی کا دست نگر نہ ہوگا۔ سیدین صاحب سے کہوں گا، لیکن اس طرح کا کام تو مدتوں سے کرتا آرہا ہوں۔ **ان سے بھی بڑے آدمی** سے کہنا سننا رہا لیکن ایک پیش نہ گئی۔ کیا کروں! وائس چانسلر صاحب کے جواب سے بددل نہ ہوں۔ اپنی جیسی کیے جایئے۔ **نہ کرنے کی ذمہ داری ان پر رکھیے۔ نہ کہنے کی ذمہ داری اپنے سر کیوں لیجئے؟** جو باتیں کتاب کے بارے میں آپ نے لکھی ہیں ان سے تو امید بندھتی ہے کہ سفینہ بخیریت تمام کنارے پر پہنچنے والا ہے، انشاءاللہ۔

یہاں آپ کے جاننے پہچاننے اور آپ کو عزیز رکھنے والے سب بخیر ہیں۔ **کاش آپ یہاں کے PRO پبلک ریلیشن آفیسر ہوجاتے۔ اس منصب کے لیے آپ کتنے موزوں تھے! لیکن میں کیا اور میری آرزوئیں کیا!!**

مخلص

رشید احمد صدیقی

کالی ربولڈ عبارتیں، اگر انشائے رشیدی سے محظوظ ہونا ہے تو، ایک بار پھر پڑھ لیجئے۔
ان سے بھی بڑے آدمی سے مراد غالباً ذاکر صاحب ہی ہوں گے۔

☆☆☆

47

۱۰/ مارچ ۱۹۶۷ء
ذکاءاللہ روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

۷/ کا نوازش نامہ۔ دیکھیے وائس چانسلر صاحب کیا کرتے یا کہتے ہیں۔ اس طرح کی خط و کتابت تو آپ دونوں میں کب سے چل رہی ہے۔

خاں صاحب اچھے ہیں اور اپنے معمولات بجالاتے رہتے ہیں۔ شروانی صاحب بھی مع الخیر ہیں۔ کئی دن ہوئے تشریف لائے تھے۔ خاں صاحب سے بھی ملے تھے۔ **انگریزی میں اپنی سوانح حیات لکھ رہے ہیں**۔ اسی سلسلے میں گفتگو کرنے آئے تھے۔

خدا کے فضل سے میں بھی کسی خاص تکلیف میں اس طرح مبتلا نہیں ہوں کہ اس کا شکوہ کروں، ورنہ وہ قباحتیں تو لاحق ہیں جو کہن سالگی اور موجودہ پرآشوب دور میں زندگی کے لوازم میں ہیں۔

احسان اچھے ہیں، خیریت کا خط آتا رہتا ہے۔ دعا ہے کہ آپ اور متعلقین مع الخیر ہوں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

مقتدا خاں صاحب شروانی نے اس زمانے میں اپنی مختصر سوانح عمری انگریزی میں لکھی تھی جو اپنے ہی ہینڈ رائٹنگ میں، اپنے احباب کو بھیجی تھی۔ غالباً ہاتھ ہی سے کئی کاپیاں نکل کی تھیں۔ ایسی ایک نقل، نقل کیوں کہیے اصل ہی ہوئی، ہمارے ذخیرے میں بھی تھی، شاید آئندہ کبھی دستیاب ہو جائے۔

☆☆☆

48

۵؍مئی ۱۹۶۷ء، بدھ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، آداب

آپ نے پچھلے عنایت نامے میں جن کاموں پر مجھے مامور کیا تھا اس کے سلسلے میں فوراً ہی کارروائی شروع کر دی تھی کہ دفعتاً **یونیورسٹی پر وہ قیامت گزر گئی** جس کی تفصیل آپ نے اخباروں میں پڑھی ہوگی اور جس سے متعلق ہر روز اکابر ملک کے بیانات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ دوستوں پر کیا گزر گئی دشمنوں کی کیسی بن آئی اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔ ایسے میں آپ کی تصنیف کے بارے میں کس سے کیا کہوں؟ یونیورسٹی معلوم نہیں کب کھلے۔ کھلے تو آپ کے توسیعی لکچروں کے بارے میں تحریک شروع کروں۔ اس وقت یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ یونیورسٹی کی آئندہ قسمت کی سمت ورفتار کیا ہوگی۔ آپ لکچر دیں گے تو شاید عام لوگ کتاب اور مصنف دونوں کی خوبیوں کا احساس کر سکیں اور کام بن جائے۔

مولانا شیروانی صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ اچھے ہیں آپ کا ذکر کافی دیر تک ہوتا رہا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں اور خوش۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

دادری کا حادثہ: طلبا کی اور دادری کے نواح کے باشندوں سے معمولی بات اور معمولی آویزش کافی طول کھینچ گئی تھی۔

☆☆☆

49

۲۰؍جنوری ۱۹۶۸ء
یونیورسٹی علی گڑھ

بھٹنا گر صاحب مکرم، تسلیم

آپ کا ایک خط جس پر کوئی تاریخ نہیں ہے ابھی ابھی ملا۔ اس سے پہلے غالباً دسمبر کے تیسرے ہفتے میں ایک اور خط ملا تھا جس پر آپ کا پتہ تحریر نہ تھا اس لیے جواب نہ دے سکا۔

ایسی بھی کیا پریشانی! پریشانی میں تو بالعموم لوگ کم پریشان ہونے یا رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خدا سے امید ہے کہ آپ کے قیام اور راحت کا سامان ہو جائے گا اور آپ بڑے اطمینان سے دہلی میں زندگی بسر کریں گے۔

چیلنج یا تو قبول نہ کرنا چاہیے اور قبول کر لیا تو اس سے نبٹنا چاہیے۔ ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

خاں صاحب مع الخیر ہیں۔ مقتدیٰ خاں صاحب سے البتہ ادھر ملنا نہیں ہوا۔ معلوم نہیں کس حال میں ہیں۔

میرا تو خیال ہے دلی آ جانے سے اپ کی تصنیف کی طباعت میں آسانی پیدا ہوگی۔ زیدی صاحب کا دامن نہ چھوڑیے گا، کیا تعجب کام بن جائے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

یہ خط سرسید بک ڈپو کے کارڈ پر لکھا ہے، یہ گویا جامعہ اردو کا بک ڈپو تھا جس کا ہیڈ کوارٹر مدتوں کانفرنس کمپاؤنڈ میں رہا۔ جامعہ اردو کے نصاب میں جو کتابیں شامل رہتی تھیں، ان کی اشاعت اسی بکڈپو سے ہوتی تھی۔ اور اس طرح اوس غربت کے زمانے میں یہ سرسید بک ڈپو مالی طور سے جامعہ اردو کی لائف لائن تھا۔ یاد رہے کہ رشید صاحب اس زمانے میں جامعہ اردو کے چانسلر بھی تھے۔☆

50

۲۷؍فروری ۱۹۶۸ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب محترم، تسلیم

۲۴؍کا والا نامہ کل موصول ہوا۔ آج ہی **بشیر صاحب** سے گفتگو کروں گا وہ جو کچھ آپ کی کتاب کے بارے میں فرمائیں (گے) اس سے آپ کو مطلع کردوں گا۔ مگر یہ سب باتیں زبانی زیادہ جلد اور بہتر طور پر کی جاسکتی ہیں۔ کسی اتوار کو آجایئے اور سب سے گفتگو کر لیجئے۔ دہلی سے علی گڑھ کچھ دور نہیں ہے۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب علی گڑھ تشریف لائے تو امید ہے موصوف سے ملاقات ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کے لیے کسی ممکن کوشش سے دریغ نہ کریں گے۔

آپ کے دوست سب بفضلہٖ مع الخیر ہیں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

بشیر صاحب سے مراد سید بشیر الدین صاحب، سابق یونیورسٹی لائبریرین۔

☆☆☆

51

۱۶/جولائی ۱۹۶۸ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

۱۵/کا نوازش نامہ ابھی ابھی ملا۔ کتاب کے بارے میں آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے پتہ چلا کہ یہ مسئلہ وہیں ہے جہاں آج سے ۵ سال پہلے تھا۔ جتنی تفصیلات آپ نے لکھی ہیں ان میں سے کوئی بھی نئی نہیں۔ اس کے یا آپ کے بارے میں میری گفتگو ذاکر صاحب سے، سیدین صاحب سے، عابد صاحب سے، وہ بھی میں کرتا رہا اور میرا خیال ہے کہ آپ کی اس کتاب کے بارے میں میں نے ان تمام اصحاب سے جس طرح اور جتنی گفتگو کی ہے کسی کے بارے میں اب تک نہیں کی۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے کیا کیا؟ کبھی خود ان اصحاب سے ملتے اور اپنا کیس پیش کرتے۔ زیدی صاحب آپ کے بڑے مربی رہے ہیں ان سے ملتے۔ ان کے وسیلے سے ذاکر صاحب سے ملتے۔ سیدین صاحب اور عابد صاحب سے ملتے رہتے۔ صادق صاحب برابر دہلی آتے جاتے رہتے ہیں، کسی نہ کسی معرفت ان کو Contact کرتے۔ کام کرنے کے یہی طریقے ہیں۔ محض کاغذی گھوڑے دوڑانے سے کبھی کام نہیں چلا ہے۔ بشیر صاحب لائبریرین بڑے سنجیدہ اور سمجھ دار آدمی ہیں۔ انھوں نے جو کچھ چاہا تھا اگر آپ ویسا نہیں کر سکتے تھے تو ان سے یہاں آ کر ملتے، میں اور خاں صاحب آپ کے ساتھ آپ کے بارے میں ان سے گفتگو کرتے۔ اس طرح یقین ہے کام آگے بڑھتا۔

دوسرے یہ کہ بے تکلف دوستوں کی اور بات ہے، لیکن دوسروں سے باضابطہ خط و کتابت کرنے میں اچھا کاغذ استعمال کرتے ہیں، خط کو ستھرا ٹائپ کراتے ہیں اور بڑے سلیقے اور نفاست سے کام لیتے ہیں۔ آپ جس طرح کے خط لکھتے ہیں وہ بڑا

Shabby ہوتا ہے۔لوگ اچھی رائے نہیں قائم کرتے۔آپ تو خط وکتابت کا کام تمام عمر کرتے رہے ہیں اور جانتے ہوں گے کہ اچھی اسٹیشنری، اچھی تحریر اور دوسرے متعلقہ آداب کو برتنا کتنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ شرائط دسوتوں کے لیے نہیں ہیں۔ وہ تو آپ کی تحریر پا کر ہر حال میں خوش ہوں گے۔میرا مطلب تو ان لوگوں سے ہے جو اجنبی ہوں، جن سے سرکاری یا بزنس کی بات کرنی، ہو وہاں ضروری آداب برتنے چاہئیں۔

میں کسی وقت بشیر صاحب سے ملوں گا اور دیکھوں گا کہ صورت حال کیا ہے۔ **ڈاکٹر علیم صاحب** نئے وائس چانسلر ہوئے ہیں ان سے آپ کو ملنا چاہیے وہ چاہیں گے تو ہر طرح کی سہولت پیدا ہو جائے گی۔ان کے اشارے سے اولڈ بوائز اور ایجوکیشنل سے کچھ خاطر خواہ مدد مل سکتی ہے۔خط وکتابت کو تھوڑی دیر کے لیے التوا میں ڈال دیجئے۔

زیدی صاحب ،سیدین صاحب، عابد صاحب، ذاکر صاحب ،ڈاکٹر علیم صاحب سے ملنے کی کوشش کیجئے۔میرے جواب خط دینے کے بارے میں آپ نے جو لطیفہ لکھا ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔لیکن یہ میری عادت ہے کہ خط کا جواب جلد سے جلد دے دیتا ہوں اور بے ضرورت عاشقانہ خطوط کبھی نہیں لکھتا۔امید ہے کہ آپ ٹھنڈے دل سے تمام باتوں پر غور کریں گے اور عملاً کچھ کریں گے۔امید ہے متعلقین مع الخیر ہوں گے۔

ان دنوں احسان آئے ہوئے ہیں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

ڈاکٹر عبدالعلیم، ممتاز ترقی پسند نقاد مفکر، ذاکر صاحب کے شاگرد، عربی وعلوم اسلامیہ کے شعبے کے چیئرمین؛ نواب علی یاور جنگ کے بعد علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے تھے (۱۹۶۸ء-۱۹۷۴)

☆☆☆

52

۲۴/جولائی

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، آداب

نوازش نامہ ملا۔ مجھے بڑی ندامت اور افسوس ہے کہ میرے پچھلے خط سے آپ کو رنج پہنچا۔ آپ میری طرف سے مایوس یا دل برداشتہ نہ ہوں اور مجھے معاف فرمادیں۔ آپ کے خلوص، شرافت اور وضعداری کا میں ویسا ہی قائل ہوں اور اس کی قدر کرتا ہوں جتنا پہلے کبھی کرتا تھا۔ اس میں شمہ برابر شک نہ کیجئے۔ آپ کی کتاب کے لیے وہ سب کرتا رہوں گا جو کر سکتا ہوں۔ اب صرف مسلم یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر پروفیسر عبدالعلیم صاحب رہ گئے ہیں جن سے کتاب کے متعلق عرض معروض کرنا ہے۔ یہ کروں گا، دیکھئے کیا کہتے ہیں۔ آدمی بڑی سوجھ بوجھ کے ہیں اور اچھے کام اور اچھے آدمیوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ اور **سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں**۔ بشیر صاحب سے بھی گفتگو کروں گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا اس سے مطلع کروں گا۔ آپ مطمئن رہیں۔ لیکن یہاں میں (یہ) بات پھر دوہراؤں گا جو پچھلے عریضہ میں کہہ چکا ہوں یعنی آپ ذاکر صاحب، زیدی صاحب، سیدین صاحب اور عابد صاحب سے وقت نکال کر ضرور ملیں۔ صادق صاحب سے دہلی میں ضرور ملاقات کیجئے۔ وہ برابر آتے رہتے ہیں۔ اس کے بغیر گاڑی آگے نہ چلے گی۔ اللہ آپ کی مدد کرے۔ آپ کا خط احسان نے دیکھ لیا ہے۔ سلام کہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح آپ سے ملاقات ہو جائے لیکن ان کی معذوریوں سے آپ واقف ہیں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

اس خط پر سنہ درج نہیں ہے۔ مہر بھی صاف نہیں ہے مگر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط ۲۴/جولائی ۶۸ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں ڈاکٹر عبدالعلیم کا بطور وائس چانسلر ذکر ہے۔ علیم صاحب نے ۱۹۶۸ء کے ..... مہینے میں یہ چارج سنبھالا تھا۔

☆☆☆

53

۱۳/اگست ۱۹۶۸ء

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

۱۲/کا نوازشنامہ!

وائس چانسلر صاحب ۳ ہفتے کے لیے آسٹریلیا تشریف لے گئے ہیں ممکن ہے اس وجہ سے آپ کے خط کا جواب نہ جاسکا ہو۔ احسان عنقریب واپس ہوں گے آپ ٹیلیفون کا نمبر لکھ بھیجیں تاکہ وہ دہلی میں آپ کو Contact کرسکیں۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی صدر شعبۂ تاریخ سے آپ کی کتاب کے بارے میں احسان نے گفتگو کی تھی۔ موصوف نے فرمایا کہ آپ وقت مقرر کر کے کسی دن آجائیں تو گفتگو ہوجائے۔ بہت ممکن ہے کتاب کی اشاعت کا موقع نکل آئے۔ میرے نزدیک بہتر ہوگا اگر آپ پروفیسر نظامی سے ملاقات کر لینے کی صورت نکالیں۔ پروفیسر سیدین اور وائس چانسلر صاحب سے بعد میں گفتگو ہوتی رہے گی۔

امید ہے آپ اور متعلقین خوش وخرم ہوں گے۔

مخلص، رشید احمد صدیقی

پروفیسر خلیق احمد نظامی مشہور مؤرخ ''تاریخ مشائخ چشت'' اور ''حیات عبدالحق محدث دہلوی''، اور تاریخ وتصوف پر تقریباً دو درجن کتابوں کے معروف مصنف؛ مولانا آزاد کے ممنوعاتی ۳۰ صفحات پر بھی آپ کی کتاب خاصی ہنگامہ خیز رہی۔ رشید صاحب کے کئی درجن خطوط/رقعات بھی رشید صاحب کی وفات کے بعد خلیق صاحب نے اپنے حواشی کے ساتھ شائع کر دیے تھے۔ رشید صاحب سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ان کے بیٹے احسان رشید صاحب (جو بعد میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے) کراچی سے آتے رہتے تھے، اس ویزٹ میں ان کے ساتھ خلیق صاحب کی گفتگو نتیجہ خیز رہی۔ نظامی صاحب جو کچھ ہی عرصے کے بعد پرو وائس چانسلر ہوئے اور پھر علیم صاحب اور نورالحسن کے باہمی مشورے سے علیم صاحب اپنے مدت کے اختتام سے ایک دن قبل وائس چانسلر شپ سے مستعفی ہوگئے تو نظامی صاحب کے پاس وائس چانسلر شپ کا چارج بھی سال بھر سے زیادہ عرصے تک رہا؛ اس وقت وہ علیم صاحب کی سپہ سالاری میں اس ایس ایس ہال کے پرووسٹ تھے۔ گفتگو کا اچھا نتیجہ ہوا۔ نظامی صاحب نے ایس ایس ہال کے طلبا سے چندہ کیا (کچھ مدد علیم صاحب کے وائس چانسلر فنڈ سے بھی ملی ہوگی) اور بھٹناگر صاحب کی کتاب، اگلے یعنی ۱۹۶۹ء میں بالآخر خلیق صاحب اور علیم صاحب کے تعارف اور تمہیدی نوٹ کے ساتھ شائع ہوگئی۔

بھٹناگر صاحب ان دنوں دہلی میں تھے۔ احسان رشید کراچی واپس ہونے والے تھے، واپسی پر دہلی میں بھٹناگر صاحب کو نظامی احسان گفتگو کے خلاصے سے مطلع کیا ہوگا، رشید صاحب نے بھٹناگر صاحب کا **ٹیلی فون نمبر** بھی مانگا ہے۔ ☆☆☆

54

۵؍ستمبر ۱۹۶۸ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

محبی بھٹناگر صاحب، تسلیم

ابھی ابھی آپ کا کارڈ ملا۔ جب سے آپ تشریف لے گئے **آپ کی کتاب** سے متعلق سوچتا رہا اور دوسروں سے مشورہ کرتا رہا۔ اس کے بعد پروفیسر نظامی صاحب سے گفتگو ہوئی۔ کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو معرض بحث میں نہ آیا ہو، اخلاقی، ذاتی یا کاروباری! بالآخر میں اس پر راضی ہو گیا کہ بالعوض اس کتاب کے جس کا آئندہ حق اشاعت سرسید ہال کو تفویض رہے گا آپ چار ہزار روپیہ قبول فرمائیں۔ اس رقم کو متعین کرنے میں حسب ذیل امور خاص طور پر مدنظر رہے۔

۱- یہ کتاب اور اس کی آمدنی کسی شخص یا کاروباری ادارے کی نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کے نفع و نیکنامی کے لیے دواماً وقف ہوگی جس کی خاطر اور جس سے متاثر ہو کر آپ نے اس کتاب کے لکھنے کا حوصلہ کیا، طرح طرح کی زحمت اٹھائی اور ایک مہتم بالشان کام کو بالآخر پورا کیا۔

۲- اس کتاب کی طباعت و اشاعت کے انصرام میں جو کچھ صرف ہوگا (اور کافی صرف ہوگا) وہ تمام تر پروسٹ سرسید ہال پروفیسر نظامی صاحب کے **گراں قدر ذاتی عطیہ** اور مذکورہ ہال کے طلبا کے چندے سے فراہم کیا جائے گا۔

۳- یہ کتاب چھپے ہوئے کم و بیش چار سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔

چار ہزار کی یہ موجودہ رقم آپ کی خدمت میں یکمشت جنوری ۱۹۶۹ء میں

پیش کر دی جائے گی ۔ مجھے امید ہے کہ جس حوصلے اور قابل تعریف جذبات سے متاثر ہوکر پروفیسر نظامی نے اس اچھے اور بڑے کام کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے اسی حوصلے اور ان ہی جذبات سے آپ موصوف کے آفر کو قبول فرمائیں گے ۔نظامی صاحب ۱۴ر ستمبر تک اس کتاب کو پریس میں دینے کے لیے دہلی تشریف لے جائیں گے ۔اس لیے چاہتے ہیں کہ جلد ہی آپ اپنے فیصلے سے موصوف کو مطلع فرمائیں ۔ امید ہے آپ خوش وخرم ہوں گے ۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

کتاب کی اشاعت کے سلسلے، میں خط مؤرخ ۱۳ر اگست کے مشتملات : نتیجہ پندرہ بیس دن ہی میں نکل آیا۔احسان صاحب کے جانے کے بعد خود رشید صاحب اور نظامی صاحب کی باہمی گفتگو ہوئی اور کتاب کے اشاعت کے بارے میں تفصیلات پر باتیں ہوگئیں ۔ یہ تفصیلات رشید صاحب نے اس خط میں لکھ دی ہیں ۔

اس لئے خط کے نوٹ میں ہم نے پیسے کی فراہمی کے ذرائع کی طرف جو اشارہ کیا تھا اس میں ،موجودہ خط کی روشنی میں **عطیۂ نظامی** کا مزید اضافہ کرلیں ۔

☆☆☆

55

۱۰/ستمبر ۱۹۶۸ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ابھی ملا۔ پڑھ کر بہت خوش ہوا اور اسے بجنسہ نظامی صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔ مزید ڈھائی سو روپئے کی ایسی کوئی اہمیت نہیں وہ انشاء اللہ آپ کی خدمت میں پیش کر دئے جائیں گے۔ بقیہ باتوں کا جواب نظامی صاحب براہِ راست دیں گے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

پچھلے خط مؤرخہ ۵/ستمبر میں درج شرائط برائے اشاعت کتاب کے سلسلے میں رشید صاحب نے امید ظاہر کی تھی کہ نظامی صاحب کے آفر کو بھٹناگر صاحب قبول فرمالیں گے۔ یہ بھی لکھا تھا کہ نظامی صاحب چاہتے ہیں کہ بھٹناگر صاحب اپنے فیصلے سے جلد موصوف کو مطلع فرمائیں۔ غالباً یہ فیصلہ دو تین روز کے اندر ہی ہوگیا اور بھٹناگر صاحب نے اپنی منظوری سے مطلع کر دیا جسے پڑھ کر رشید صاحب نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

پچھلے خط مؤرخہ ۵/ستمبر میں دوسری شرائط کے من جملہ بھٹناگر صاحب کو چار ہزار بطور حق تصنیف کی پیش کش بھی شامل تھی۔ بھٹناگر صاحب نے اپنی منظوری بھیجتے ہوئے ڈھائی سو روپے ٹائپسٹ کا معاوضہ (یا اسی قسم کی کوئی اور مد) مزید بڑھانے کے لئے لکھا تھا جسے رشید صاحب نے (غالباً نظامی صاحب کی سہمتی سے) منظور کر لیا۔

☆☆☆

56

بدھ، ۲۵؍ستمبر ۱۹۶۸ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

نظامی صاحب کا ۲۳ ستمبر کا طویل ٹائپ شدہ خط میرے سامنے ہے جو ابھی ابھی موصول ہوا۔ نظامی صاحب کو میں نے ہی لکھا تھا کہ مصنف کی یہ فرمائش بے جا نہیں ہے کہ وہ اپنی **ترمیم شدہ** تصنیف کو پریس جانے سے پہلے **ایک نظر دیکھ لے**، بلکہ یہاں تک لکھ دیا تھا کہ اپنی تصنیف سے مصنف کا تقریباً خون کا رشتہ ہوتا ہے، اس لیے اس کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے وغیرہ۔ خط دیکھنے سے معلوم ہوا کہ **مختصر کرنے کا کام** وہ آپ کے سپرد کر دینا چاہتے ہیں۔ میری رائے میں یہ ٹھیک نہ ہوگا۔ نظامی صاحب اس کام کو بہتر طور پر کریں گے۔

ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ آپ اس کام کو میرے اللہ کے سپرد کیجئے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ آپ کا کوئی اللہ نہیں ہے ورنہ میں اسی کے سپرد کرنے کا مشورہ دیتا۔ نظامی صاحب نے اس کام کو جس خلوص سے اپنے ہاتھ میں لیا ہے اسی قابلیت سے وہ اس کو پورا کریں گے۔ **اب مہم کو سر ہو جانے دیجئے۔ پہلے، دوسرے بہانے تراشتے تھے اب آپ خود نہ روڑے اٹکائیے۔**

مخلص

رشید احمد صدیقی

''ترمیم شدہ تصنیف'' کالی ر بولڈ عبارتوں کا ماحصل یہ رہا کہ کتاب غالباً مصنف کو، ترمیمیں دکھائے بغیر، شائع ہوگئی۔ ''مختصر کرنے کی طرف بھی خط میں اشارہ ہے۔

ناشر (خلیق احمد نظامی صاحب) نے جو عبارتیں کم کی ہوں گی اس سے بھی غالباً مصنف کو اتفاق نہ ہوگا۔ مصنف کو ترمیمیں نہ دکھانے، اور اختصار کی مزید منظوری نہ لینے کے پیچھے غالباً مالی مشکلات کے علاوہ یہ بات بھی ہوگی کہ اشاعت میں مزید تاخیر نہ ہو۔ اس کی طرف رشید صاحب نے بھی خط کے آخری جملوں میں اشارہ کیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ کتاب شائع کرانے میں رشید صاحب کامیاب ہو گئے مگر اشاعت کے بعد بھٹناگر صاحب مطمئن نہیں پائے گئے، بلکہ خاصے دل برداشتہ، بددل اور بدحظ تھے۔

☆☆☆

57

۲۵/اکتوبر ۱۹۶۸ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

۲۳/کا گرامی نامہ!

نظامی صاحب سے حال ہی میں ملاقات ہوئی تھی، فرمایا کہ ''کام شروع کر دیا گیا ہے'' موصوف کا یہ فرمانا اس بات کی ضمانت ہے کہ کام بہت اچھا ہوگا اور جلد ہوگا۔ یہ بھی امید ہے کہ آپ اسے پسند کریں گے۔

نظامی صاحب کو یاد دلاؤں گا کہ آپ اپنے خطوط کے جواب کے منتظر ہیں۔ اپنے محدود ذرائع اور وسائل کو دیکھتے ہوئے کیسے کہہ سکتا ہوں کہ آپ جس طرح **تحقیقات کا کام** یہاں کرنا چاہتے ہیں وہ کہاں تک ممکن ہے۔ اس میں کچھ قانونی دشواریاں پیش آ سکتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ حکام کی طرف سے مخصوص سہولتیں فراہم کی جائیں، ان مشکلات پر کیسے قابو پایا جائے!! بہر حال پردۂ غیب سے بہتر ہی کی توقع رکھنی چاہیے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

کتاب کی اشاعت کا مرحلہ طے کرنے کے بعد بھٹناگر صاحب علی گڑھ تحریک کے کام کو آگے بڑھانا چاہتے تھے اور باضابطہ طور سے ریسرچ کا کام بڑے پیمانے پر کرنے اور کرانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے اس لئے اب سکون کے ساتھ کام بھی کر سکتے تھے۔ لیکن رشید صاحب ''قانونی'' دشواریوں کا جو ذکر کیا ہے غالباً وہی آڑے ہوں گی، یعنی بھٹناگر صاحب کے پاس ایم اے کی ڈگری یا پی ایچ ڈی کی ڈگری یا اس خاص سبجیکٹ میں ڈگری جس کا تعلق ان کے پروجکٹ سے ہو وغیرہ وغیرہ۔ یوں بھی کام تو ہو ہی گیا تھا اب نظامی صاحب یا کوئی اور نئے بکھیڑے میں کہاں پھنستا۔

☆☆☆

58

۲۴؍فروری ۱۹۶۹ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، آداب

یہ آپ کے ۱۳ تاریخ کے عنایت نامہ کا جواب ہے۔ غالب کی صد سالہ تقریب اور **نظام لکچرز** کے سلسلے میں اتنا مصروف اور پریشان رہا کہ جواب نہ لکھ سکا۔ ۱۱؍ سے ۲۲؍ تک کا زمانہ دہلی آنے جانے میں گزرا۔ کل ۲۳؍ کو علی گڑھ آیا۔ آپ نے جتنی باتیں اپنے کرم سے میرے بارے میں تحریر فرمائی ہیں ان کے لیے دل سے شکر گزار ہوں۔ گو اس کا اظہار رسمی سا معلوم ہوتا ہے۔ نظامی صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کی تصنیف کا ذکر تفصیل سے رہا۔ آپ یقین رکھیں ہر بات انشاءاللہ توقع کے مطابق ہوگی۔ دیر سویر ہوتا ہی رہتا ہے۔

مولوی **مقتدیٰ خاں شروانی کا انتقال** ہوگیا۔ مہینہ بھر سے اوپر ہوا ادھر بہت کمزور ہوگئے تھے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔ کیسے اچھے اور کھرے انسان تھے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

نظام لکچرز، دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے نظام دکن کے عطیہ سے قائم کرائے تھے۔ یہ خطبات کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اسی نظام لکچرز سریز میں پروفیسر محمد حبیب کا ایک لکچر ''نظام الدین اولیا'' پر ہوا۔ ایک اور اچھا لکچر خلیق احمد نظامی صاحب کا ''دہلی کے اوراق مصور'' پر رہا۔ سید ین صاحب کا ایک معرکہ آرا لکچر ہوا، جس کا موضوع تھا ''فکر انسانی کا ارتقا''۔ رشید صاحب کے لکچر کی اہمیت یہ تھی کہ اس سے نظام لکچرز کا آغاز ہوا۔ یہ سب لکچرز شائع ہو چکے ہیں۔

مقتدا خاں صاحب شروانی کی وفات سے رشید صاحب (اور بھٹناگر صاحب) کی تثلیث کا ایک عنصر کم ہوگیا۔

☆☆☆

59

یکم/مارچ ۱۹۶۹ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، آداب

۲۶/کا گرامی نامہ ۲۷/کو مل گیا تھا۔ اسی وقت نظامی صاحب سے رجوع کیا تو حسب ذیل جواب آیا۔

''.....بھٹناگر صاحب کو پرسوں خط بھیجا ہے..... میں نے ۲۸/فروری تک وعدہ کیا تھا کہ رقم پہنچ جائے گی۔ بہر حال آج (۲۷/فروری کو) تین ہزار (۳۰۰۰) کا چیک ان کو بھیج دیا ہے۔ بقیہ ایک ہزار بھی انشاءاللہ بہت جلد بھیج دوں گا۔ میں نے ان کو اس زمانے میں کئی Chapters بھیجے ہیں۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ ان تک نہیں پہنچے۔ انشاءاللہ کتاب وقت پر مکمل کر لی جائے گی۔''

اس سے امید ہے آپ کو اطمینان ہو جائے گا۔

مولانا **مقتدیٰ خاں** صاحب مرحوم کے لیے آپ نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے ان میں مجھے اپنا شریک سمجھیے۔ انھوں نے علی گڑھ کے بارے میں آپ کو جو **معلومات فراہم کیے** آپ نے ان سے آنے والی نسلوں کو فائدہ پہنچانے کا انصرام کر دیا جو آج تک کسی نے نہیں کیا تھا۔ اس سے بڑھ کر **آپ دونوں** ایک دوسرے سے اور کیا بہتر اور پائدار سلوک کر سکتے تھے۔ اور دونوں مل کر ہم سب کی طرف سے جو فرض ادا کر رہے ہیں اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

اس خط کا دوسرا پیراگراف مقتدیٰ خاں صاحب مرحوم کے لئے وقف ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھٹناگر صاحب کے کتابی اور زبانی اہم ترین مآخذ میں مقتدا خاں سب سے آگے اور سب سے قیمتی رہے ہوں گے۔ یوں بھی وہ علی گڑھ کالج کی چلتی پھرتی تاریخ تھے اپنی زندگی کو اسی ادارے اور تحریک کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اللہ نے مہلت بھی اچھی دی اور توفیق بھی: (۱۹۰۰۔۔۔ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۹ء میں وفات پائی)۔

☆☆☆

60

۷/مارچ ۱۹۶۹ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

۶/کا والا نامہ ملا۔ شروانی صاحب مرحوم پر آپ نے جس طرح اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کیا ہے وہ آپ کے شایان شان ہے۔ آپ نے اپنی ہی طرف سے نہیں بلکہ ان بے شمار لوگوں کی طرف سے بھی حق ادا کر دیا جو آپ ہی کی طرح شروانی صاحب مرحوم کو عزیز رکھتے اور مکرم جانتے تھے۔

میرا پچھلا عریضہ مل گیا ہوگا جس میں اطلاع دی تھی کہ نظامی صاحب نے تین ہزار کا چیک آپ کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔ بقیہ ایک ہزار بھی بہت جلد ادا کر دیں گے۔ مجھے خط لکھیے تو ہمیشہ اپنا پتہ لکھ دیا کیجئے، ورنہ کاغذوں میں تلاش کرنے میں بڑی دیر لگتی اور زحمت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس خط کے لکھنے میں یہی دشواری پیش آئی۔ آپ کا موجودہ پتہ یاد رکھنا میرے لیے بہت مشکل ہے یہی سبب ہے کہ اسے نوٹ کر لیا ہے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

☆☆☆

61

۲۸/اپریل ۱۹۶۹ء
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

بھٹنا گر صاحب محترم، آداب

عنایت نامہ ملا تھا۔ خیال تھا کہ آپ ۲۶/کی تقریب میں تشریف لائیں گے تو **کتاب کی تکمیل اور اجرا** پر آپ کو جی بھر کر مبارک باد دوں گا اور خوش ہوں گا۔ بہر حال آپ کے کارنامے نے حیات جاوید پائی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ بے حساب شکر۔

اس وقت وہ ابتدائی دن (یاد) آتے ہیں جب آپ اس کو ترتیب دے رہے تھے پھر وہ دشواریاں جن کا قدم قدم پر سامنا ہوا۔ کاش مولانا محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی زندہ ہوتے۔ اس تقریب میں بڑے شوق سے شریک ہوتے، نظم کہتے اور تحفہ میں کتاب کا ایک نسخہ پاتے۔ وہ منظر بھی دیکھنے لائق ہوتا۔

امید ہے آپ خوش وخرم ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

بالآخر بھٹنا گر صاحب کی کتاب کی طباعت مکمل ہوگئی اور اجرا بھی ہوگیا، بلکہ اجرا کی تقریب بھی۔

☆☆☆

62

۹؍مئی ۱۹۶۹ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب محترم، تسلیم

نوازش نامہ صادر ہوا۔ **ذاکر صاحب کی وفات** سے طبیعت کچھ اس طرح افسردہ بھی ہے، اور بے قرار بھی، کہ روزانہ کے معمولات پورے کرنے بھی تلخ معلوم ہونے لگے ہیں۔ ذرا افاقہ ہو تو تفصیل سے لکھوں گا۔

آپ نے جس محبت سے غم خواری کی ہے اس سے بہت متاثر ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

ذاکر صاحب کی وفات ۳؍مئی ۱۹۶۹ء کو ہوئی، راشٹر پتی بھون میں۔ مدت صدارت ابھی آدھی بھی نہیں ہوئی تھی، غالب صدی تقریبات منائی جا چکی تھی جس سے ذاکر صاحب یقیناً خوش گئے ہوں گے غالب کے مہینے فروری ہی میں نظام لکچرز سریز میں رشید صاحب کا نظام لکچر غالب ہی پر ہو چکا تھا، اور ذاکر صاحب یا تو اس لکچرز تقریب کے مہمان خصوصی رہے ہوں گے یا الگ سے ملاقات رہی ہوگی۔ فروری میں ذاکر صاحب کے احباب (خاص کر مالک رام) نے ان کی سالگرہ منا کے دو جلدوں ایک انگریزی اور ایک اردو میں انہیں دو مجلدات بھی پیش کئے تھے اور اس موقع پر ذاکر صاحب کی ایک زبانی تقریر بھی ہوئی تھی، تین چار منٹ کی! فروری (نظام لکچرز کی تاریخ) اور ۳؍مئی (ذاکر صاحب کی وفات) میں بمشکل دو مہینے کا وقفہ ہوا تھا! مدت العمر کا ساتھ تھا، قدرتاً رشید صاحب افسردہ بھی ہوں گے بیقرار بھی۔ ذاکر صاحب پر رشید صاحب کی ایک کتاب تو ۱۹۴۰ء کے آس پاس نکلی، عنوان تھا ''ذاکر صاحب''۔ پھر ہمارے دوست عبداللطیف اعظمی صاحب نے رشید صاحب کی ذاکر صاحب کے بارے میں دوسری تحریریں بھی جمع کر لیں اور پچھلی کتاب کے ساتھ شامل کر کے اکی ضخیم تر تصنیف ''ہمارے ذاکر صاحب'' کے نام سے مکتبہ جامعہ ہی سے شائع کرادی وہ ایسے نیک کام خاموشی سے کرتے رہتے تھے۔ رشید صاحب اپنے نام (رشید) کی مناسبت سے ذاکر صاحب کو، مرشد کہہ کر، نام کے ضمیر کے طور پر بھی استعمال کرتے تھے۔

☆☆☆

63

۱۵/جولائی ۱۹۶۹ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

بھٹناگر صاحب محترم، آداب

۱۲/کا نوازش نامہ (ملا) جسے پڑھ کر افسوس ہوا۔ جس بات کو میں ہی نہیں سبھی آپ کا اور نظامی صاحب کا کارنامہ (achievement) سمجھتے تھے وہ بالآخر آپ دونوں کی **ایک دوسرے سے بدگمانی** (جو بیزاری تک پہنچے تو کوئی عجب نہیں) کا باعث ہوا۔ اسی کو ٹریجڈی بھی کہتے ہیں۔ ۸-۱۰ دن ہوئے نظامی صاحب سے اس مسئلہ پر تفصیل سے گفتگو ہوئی تھی۔ آپ کو جتنی شکایت ان سے ہے، کم وبیش اتنی ہی شکایت ان کو آپ سے ہے۔ ان پر بحث کرنا یا ان کو منقح میرے بس کی بات نہیں۔ لیکن اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا اس کتاب کو لکھ ڈالنا اور نظامی صاحب کا اس کو چھپوا دینا میرے ہی نہیں سب کے نزدیک اس ادارے کی بہت بڑی خدمت ہے جس کے لیے علی گڑھ کا اچھا چاہنے والے آپ دونوں کے ہمیشہ احسان مندر ہیں گے۔ یہ خدمت آج تک کوئی دوسرا نہیں بجالایا تھا۔

آپ یقین رکھیں آپ کو ۲۵ یا ۲۶ جلدیں بالضرور ملیں گی۔ شاید اس کا انتظار ہے کہ **ایشیا پبلشنگ** کے یہاں سے کتابیں موصول ہو جائیں ہر معاہدہ تحریری ہی نہیں ہوتا سب سے بڑا معاہدہ وہ ہے جو دو شریفوں کے درمیان ہو، اور مجھے یقین ہے کہ فریقین انتہائی شریف ہیں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

کتاب شائع ہو چکی ہے اور دو طرفہ بدگمانی کا آغاز ہو چکا ہے، ہم نے پچھلے صفحات کے حواشی میں جس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایشیا پبلشنگ یونیورسٹی کی بعض کتابوں کو معقول رقم لے کر شائع کرنے میں مدد کرتا تھا۔ ایشیا کا یہ سلسلہ دوسری متعدد یونیورسٹیوں اور اداروں کے ساتھ بھی رہتا تھا۔

☆☆☆

64

منگل
۵/اگست ۱۹۶۹ء
ذاکر باغ، علی گڑھ یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

کچھ دن ہوئے عنایت نامہ ملا تھا۔ میں نے اسی دن تمام ضروری کارروائی کر دی، یعنی آپ جو کچھ چاہتے تھے اس کو لکھ کر اپنی وکالت کے ساتھ نظامی صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔ آپ کا خط بھی ملفوف کر دیا تھا۔ مجھے یقین ہے نظامی صاحب نے وہ سب کر دیا ہوگا جو آپ ان سے چاہتے ہیں، یا ممکن ہے ابھی اس کا موقع نہ آیا ہو۔ کبھی ملاقات ہوئی تو دریافت کروں گا کہ صورت حال کیا ہے۔ بہر حال مطمئن رہیے جلد یا بدیر سارے کام ہو جائیں گے۔ انشاءاللہ
سب کو سلام و دعا

آپ کا
رشید احمد صدیقی

☆☆☆

65

۱۳/دسمبر ۱۹۶۹ء
ذاکر باغ
یونیورسٹی، علی گڑھ

محبّ مکرم، آداب۔

۱۰/کا نوازش نامہ ابھی ابھی موصول ہوا۔ عمر، بیماری اور زمانہ کو دیکھتے ہوئے میری صحت اس سے کسی قدر بہتر ہی ہے جتنی کہ ہونی چاہیے تھی یا میں مستحق ہوسکتا تھا۔

آپ کی صحت و عافیت معلوم کر کے خوش ہوا۔ آپ نے جو شعر لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اس سے زیادہ صحت مند ہیں جتنا کہ لکھا ہے۔ جس کو اتنے اچھے اشعار یاد ہوں وہی ایم.اے.او کالج کی داستان لکھ سکتا ہے۔

آپ کے بارے میں نظامی صاحب سے دریافت حال کر لیا کرتا تھا اور یہ معلوم کر کے مطمئن ہو گیا کہ آپ کی تصنیف کے مطلوبہ و موجودہ نسخے آپ کو مل گئے۔ موجودہ نوکری کو جسے میں اچھے مشغلے سے تعبیر کرتا ہوں کبھی نہ چھوڑیئے گا۔ اس سے وابستہ رہنے میں آپ کی تعمیری اور ادبی صلاحتیں بیدار رہیں گی۔ اور یہ بہت ضروری ہے۔

دعا ہے کہ آپ مسرور و مع الخیر ہوں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

☆☆☆

66

۱رجنوری ۱۹۷۱ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

بھٹناگر صاحب محترم، آداب

۷رکا نوازش نامہ ابھی ابھی موصول ہوا۔ عید اور نئے سال کی مبارک باد صادر ہوئی تھی لیکن آپ کا پتہ کسی پر درج نہ تھا۔ اس لیے جواب نہ دے سکا نہ شکریہ کا عریضہ لکھ سکا۔ وہ اب کرتا ہوں اور توقف کا الزام بھی اپنے سر لیتا ہوں۔ آپ کی دعا سے اچھا ہوں، اتنا ہی اچھا جتنا اس عمر میں اور صحت کی بنا پر کوئی ہوسکتا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ آپ اپنے موجودہ منصب سے مسرور اور مطمئن ہوں گے۔

یہاں آپ کے شناسا سب خیریت سے ہیں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

☆☆☆

67

۱۶/ ۱۷رفروری ۱۹۷۲ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

محبّ مکرم، تسلیم

گرامی نامہ ملا۔ آپ نے یاد کرلیا۔ جی خوش ہوا، اور آپ کی محبت اور شرافت کی باتیں یاد آئیں۔

بیماری کی فکر نہ کیجئے جاتی رہے گی۔ اکثر جانے ہی کے لیے آتی ہے۔

جیلانی صاحب سے سرِ راہ کبھی کبھی ملاقات ہوجاتی ہے تو آپ یاد آنے لگتے ہیں۔

میری رائے ہے کہ زمانے کے مکروہات و مصائب پر لعنت بھیجئے اور اپنا تصنیفی کام شروع کردیجئے۔ یوں بھی کالج کے بعد یونیورسٹی کی داستان لکھنے کا فرض آپ پر عائد ہوتا ہے۔ **اچھا کام شروع کردینے سے صحت بحال رہتی ہے۔**

غازی آباد علی گڑھ سے کچھ دور نہیں ہے۔ کبھی کبھی آجایا کیجئے ہم سب خوش ہوں گے۔

اللہ آپ کی مدد کرے۔ معلوم نہیں خدا کے بارے میں آپ کی رائے کچھ بدلی یا نہیں!

مخلص
رشید احمد صدیقی

کالی ربولڈ سطریں!

ان دنوں **بھٹناگر صاحب غازی آباد** میں کوئی نئی ملازمت کرچکے تھے۔ ☆☆☆

68

سنیچر، ۲۳؍فروری ۷۲ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

کل آپ کا خط پا کر بہت خوش ہوا۔ آپ کی تصنیف کی پذیرائی ویسی ہی ہوئی جیسی کہ توقع تھی۔ آپ نے جن اخبارات کا حوالہ دیا ہے وہ مجھے نہ مل سکیں گے۔ میں جو چاہتا تھا وہ پورا ہوا۔ یعنی اہل فکر ونظر (**دانشوروں**) میں آپ کی تصنیف مقبول ہوئی۔ اب یہ خواہش پوری ہونی رہ گئی ہے کہ اس کا ترجمہ دوسری ملکی زبانوں اور فارسی اور عربی میں ہو۔

آپ کو اس کامیابی پر دل سے مبارک باد دیتا ہوں۔ ابھی لوگوں کو اس کا کم احساس ہے کہ آپ نے علی گڑھ کی کتنی بڑی خدمت انجام دی ہے۔

میری صحت اب یونہی سی رہنے لگی ہے۔ احسان اس سال نہ آسکے۔ اب اگر آئیں تو انشاءاللہ جولائی اگست میں آسکیں گے۔ امید ہے **صاحبزادی** صاحبہ مع الخیر ہوں گی۔ بیگم صاحبہ کو آداب اور صاحبزادی کو دعا پہنچایئے۔

خدا کرے آپ کی صحت اچھی ہو اور زیادہ سے زیادہ ذمہ داری کے فرائض سپرد ہوں۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

صاحبزادی کے ساتھ ہی شاید قیام پذیر تھے۔
صحیح یہی ہے کہ **دانشوری** میں فکر ونظر دونوں شامل ہیں۔

اس خط کا مسئلہ یہ ھے کہ سال ۷۲ء ھے یا ۷۳ء فی الحال اسے ھم نے ۷۲ء کی سیریز میں رکھ لیا ھے۔

☆☆☆

69

۳/مارچ ۱۹۷۲ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

عنایت نامہ مورخہ ۲۶/فروری کل ۲/کو صادر ہوا۔ آپ نے جس محبت سے تہنیت بھیجی ہے اس (سے) جی خوش ہوا، ایسی خوشی جس میں شکر گزاری شامل ہوتی ہے۔ **جی چاہتا ہے کہ ایم.اے.او کالج کی طرح آپ یونیورسٹی کی تاریخ لکھ ہی ڈالتے۔** آخر ایم.اے.او کالج لکھتے وقت تو آپ کو بالکل خیال نہ تھا کہ اس کا حق محنت وصول کریں گے، لیکن اللہ نے کچھ نہ کچھ انتظام کر ہی دیا، باوجود اس کے کہ وہ کافی نہ تھا۔ یوں بھی آپ علمی اور ادبی کاموں کو روپیوں میں نہیں تولتے۔ آپ بالکل دولت مند نہیں ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ تنگی ترشی سے بسر ہوتی ہو۔ اس بنا پر جی چاہتا ہے کہ یہ کام آپ شروع کر دیں۔ معاوضہ کے بارے میں کیا عرض کروں غالباً شیخ سعدی کا قول ہے کہ لیئم Laiem (کنجوس-بدبخت) کرم سے محروم ہے اور کریم (بخشش والے) کے پاس درم (پیسے) نہیں۔ کوئی مجھ سے اتفاق کرے یا نہ کرے **یونیورسٹی پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً آپ کا بہت بڑا احسان ہے کہ آپ نے وہ کیا جو ہم میں اب تک کوئی نہ کر سکا۔ کیا یہ امتیاز قابل افتخار نہیں ہے۔** آپ علی گڑھ آئے تو تفصیل سے گفتگو ہوگی۔

چاہتا ہوں کہ آپ غازی آباد نہ چھوڑیں تاکہ علی گڑھ سے آپ کا رابطہ آسان ہو۔ **جے پور** جا کر یہ سہولت باقی نہ رہ سکے گی۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

کالی/بولڈ عبارت قابل توجہ ہے۔ ایسا غیر معمولی خراج تحسین کسی نے کم کسی کو ادا کیا ہوگا۔
جے پور کا ذکر بھی سرسری سا ہوا۔ آخری زمانے میں بھٹناگر صاحب کے لئے دو جگہوں میں کشش رہی غازی آباد اور جے پور۔ غالباً جے پور ہی میں بھٹناگر صاحب کی صاحبزادی قیام پذیر ہوئیں۔

☆☆☆

70

۱۰/ مارچ ۱۹۷۲ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

نوازش نامہ کل شام ملا۔ آپ نے جس تفصیل سے جتنی باتیں لکھی ہیں ان سے مجھے پورے طور پر اتفاق ہے۔ معاوضہ وہ بھی معقول معاوضہ، بغیر نہ کوئی کام ہوسکتا ہے نہ اس کی توقع رکھنی چاہیے۔ اپنے فرائض منصبی کے علاوہ ایم.اے.او کالج کی تاریخ کا ضمنی یا شوقیہ کام آپ نے علی گڑھ میں کیا، وہ سمجھ میں آتا ہے۔ اس لیے کہ علی گڑھ میں مستقل قیام اور تنخواہ کی طرف سے اطمینان تھا۔ آپ نے لکھا تھا کہ اپنے موجودہ مشاغل سے آپ مطمئن نہیں ہیں اس لیے کہ طلبہ سے سابقہ ہے اور ان سے نبٹنا آسان نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے لیکن زمانہ ایسا ہے کہ مشکل سے مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ کوئی روزی یا روزگار اس کے بغیر ممکن نہیں۔ خیال تھا کہ غازی آباد علی گڑھ سے دور نہیں۔ ممکن ہے آپ ایسا کرسکیں کہ مستقل کام غازی آباد کا ہو اور ضمنی یا تفریحی تاریخ کا۔ اب رہا علیگڑھ میں کسی انتظام کا ہو جانا، یہ میں سمجھتا ہوں کہ ناممکن ہے۔ جہاں اور جب ہر شخص اپنے نفع ونقصان کو دیکھتا ہو وہاں اس کام کی کس کو فکر ہوگی جو آپ کرنا چاہتے ہیں، یعنی ادارے کی ایک مستند تاریخ لکھنا جس کی بڑی ضرورت ہے اور جو نہایت درجے مفید ثابت ہوگی۔ **جے پور** جا کر گوشہ گیر ہو جانا آپ کے لیے سازگار نہ ہوگا۔ علمی کاموں میں جس طرح آپ تمام عمر مصروف رہے ہیں اس کے بغیر آپکے لیے زندگی ناقابل برداشت ہو جائے گی۔ بقیہ بروقت ملاقات انشاءاللہ۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

71

۲/جون۱۹۷۲ء
ذاکر باغ،
یونیورسٹی-علی گڑھ

بھٹناگر صاحب مکرم، آداب

کئی دن ہوئے نوازش نامہ صادر ہوا تھا۔ یاد فرمائی کا شکر گزار ہوں۔ ان دنوں طبیعت اچھی نہیں رہی۔ پھر بھی بعض مجبوریوں کے باعث لکھنا پڑھنا بند ہے۔ خاں صاحب کے پاس آنا جانا بہت کم رہ گیا بس سال میں دو تین بار۔

غازی آباد جیسے صنعتی گاؤں میں اگر کوئی علی گڑھ کو نہ جانتا ہو تو عجب نہیں۔ مجھے تو یہ یقین ہے کہ علی گڑھ آپ کو اور آپ علی گڑھ کو کبھی نہ بھولیں گے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

☆☆☆

72

اتوار، ۲۴؍ستمبر ۱۹۷۲ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
بھٹناگر صاحب مکرم، آداب

۲۲؍کا نوازش نامہ کل شام ملا۔ خوب یاد آئے اور خوب یاد دلایا۔ آپ نے اپنے آئندہ مشاغل اور قیام کا جو پروگرام بنایا ہے وہ مناسب ہے۔ انشاءاللہ مبارک ثابت ہوگا۔ آپ نے اپنی مجوزہ تصنیف سے ہندو مسلم تفرقہ کو بے بنیاد بتانے کا جو پروگرام بنایا ہے وہ آپ کی تصنیفی سرگرمیوں اور خاندانی روایات کے عین مطابق ہے۔ آپ اس طرح کے جو کام شروع کرتے ہیں اسے پورا کر کے رہتے ہیں اس لیے قوی امید ہے کہ یہ مہم بھی سر کر کے رہیں گے۔ انشاءاللہ

چند سال ہوئے یہاں اس کی تحریک شروع کی گئی تھی کہ مسلم یونیورسٹی کی **جوبلی** منائی جائے۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ **اسکیم ملتوی ہوگئی**۔ ارادہ تھا کہ **جوبلی کے موقع پر اپنے طلبا کو ایک خطبہ** دوں گا اور ایسا نہ ہوسکا تو اسے چھپوا کر تقسیم کر دوں گا۔ چنانچہ لکھنا شروع کر دیا۔ جوبلی تو نہیں ہوئی لیکن لکھنا جاری رہا۔ رفتہ رفتہ سو سوا سو صفحات ہوگئے۔ پورا خطبہ کسی رسالے میں شائع نہیں ہوسکا۔ البتہ کچھ اجزا یونیورسٹی کے سہ ماہی ادبی علمی رسالہ فکر و نظر میں شائع ہوگئے۔ چند اوراق علی گڑھ تحریک ثانی کے نام سے رسالے کی حالیہ اشاعت میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کے کچھ Reprint لے لیے تھے جن میں سے ایک نسخہ آپ کے مطالعہ کے لیے بھیجتا ہوں۔ اس کی محرک آپ کی مجوزہ کتاب The Hindu Muslim Disunity ہوئی۔ مرسلہ پمفلٹ پڑھ کر اپنی رائے سے مطلع فرمائے گا۔ یہ ایک مبارک اتفاق معلوم ہوتا ہے کہ میرے اور آپ دونوں کے مقاصد ایک ہیں اور بیک وقت سامنے آئے۔ آپ نے کتاب کا جو نام تجویز کیا ہے وہ زیادہ پرکشش نہیں معلوم ہوتا۔ کچھ اور سوچیے لیکن اس وجہ سے کام شروع کر دینے میں توقف نہ کیجیے گا۔ نیت اچھی ہو اور حوالے

مستند، تو کتاب مقبول ہو کر رہتی ہے۔ آپ نے ایم.اے.او کالج کی تاریخ لکھ کر ہم سب (پر) بڑا احسان کیا ہے دوسرا احسان پیش نظر ہے۔ ظاہر ہے یہ مہم جتنی اہم ہے اس سے زیادہ مشکل ہے۔ میرا کچھ اس طرح کا خیال ہے کہ جو شخص (تحریک) ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کا دوست بنا دے گی اس کا نام تاریخ میں سب سے زیادہ روشن ہوگا، اور اس کا نام ہمیشہ بڑائی اور شکر گزاری سے لیا جائے گا۔ کتنا بڑا امتیاز آپ کو حاصل ہوگا۔ کہ آپ اس کی پہل کر رہے ہیں۔ اللہ آپ کی مدد فرمائے۔ آمین

جن حالات سے گزر رہا ہوں اس کو دیکھتے ہوئے اپنی صحت کو بہت غنیمت سمجھتا ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ **حواس درست ہیں، نیت بخیر ہے، نقل و حرکت سے زیادہ معذور نہیں ہوں، بچوں اور عزیزوں کی صحبت اور شریفوں کی ہمدمی حاصل ہے، اس کے بعد اور اس کے علاوہ کیا چاہیے۔**

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

مجوزہ کتاب کے نام میں Disunity کے بجائے Amity یا Accord یا ان سے بہتر الفاظ لانے کی کوشش کی جائے تو مناسب رہے گا۔

علیم صاحب کی وائس چانسلر شپ میں یہ طے ہوا کہ یونیورسٹی کی جوبلی منائی جائے کہ لگ بھگ سو سال ایم۔اے۔او کالج کے قیام کو پورے ہونے والے تھے۔ مگر اس درمیان میں علی یاور جنگ قضیے کے نتیجے میں یونیورسٹی کے دستور کو معطل کرنے کی جو نوبت آ چکی تھی، اور اس کے بعد ایک عارضی حکمنامہ (آرڈیننس) کے تحت یونیورسٹی چل رہی تھی، اور یونیورسٹی کی آزادی بحال کرنے کے لئے علی گڑھ کے اولڈ بوائز نے جو تحریک چلا رکھی تھی، جس کا ساتھ یونیورسٹی کے موجود طلبا بھی دینے لگے تھے، س سب کے نتیجے میں جوبلی منانے کے خلاف طلبا نے اپنے غموں و غصے کا بھرپور اظہار کر دیا، جس پر علیم صاحب نے ایک جملے میں فیصلہ لے لیا کہ ''آپ لوگ جوبلی تقریبات منانا نہیں چاہتے، تو ٹھیک ہے، جوبلی نہیں منائی جائے گی''۔

جوبلی کی تقریب سے رشید صاحب نے ''عزیزان علی گڑھ کے نام'' سے ایک طویل خطبہ لکھا تھا جس کا کچھ حصہ 'فکر و نظر' میں بھی شائع ہوا، اور مکمل طور سے کتابی شکل میں بھی آیا (باضابطہ یا ریپرنٹ)۔

کالی / بولڈ عبارت توجہ طلب!

☆☆☆

73

۳۰؍ستمبر۱۹۷۲ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبّ مکرم، آداب

۲۶؍کا والا نامہ ابھی ابھی موصول ہوا۔ آپ نے جتنی باتیں جس تفصیل سے لکھی ہیں اس کو پڑھ کر اطمینان ہو کہ **مجوزہ علی گڑھ تحریک ثانی** آپ کو پسند آئی اور موجودہ حالات میں اس کی ضرورت ہے۔ میری صحت اچھی نہیں ہے اس لیے اندیشہ ہے کہ اس **تحریک کی تفصیلات نہ پیش کرسکوں گا**۔ مگر مجھے امید ہے کہ آپ نے جو کام شروع کیا ہے اسے پورا کر کے رہیں گے، خواہ کوئی آپ سے تعاون کرے یا نہیں۔ میں تو کچھ بھی نہیں کرسکتا، ہر ہفتہ عشرہ کوئی نیا آزار پیدا ہو جاتا ہے یا پرانی تکالیف میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نقل و حرکت پر بھی کافی سے زیادہ ہی پابندی عائد کردی گئی ہے۔

جے پور کے جن صاحب کا نام آپ نے لکھا ہے ان سے میں واقف نہیں ہوں، بہت ممکن ہے اولڈ بوائے ہوں، یوں بھی میرا خیال ہے کہ جے پور میں آپ کو کافی تعداد میں اولڈ بوائز مل جائیں گے۔ ایک بات کا خیال رکھیے گا کتابیں **زیادہ سے زیادہ پڑھیے گا لیکن لکھیے گا وہی جس کی گواہی آپ کا دل دے۔ دل کی گواہی بڑی معتبر ہوتی ہے۔**

آپ کا
رشید احمد صدیقی

علی گڑھ تحریک ثانی سے مراد رشید صاحب اور ڈاکٹر مسعود حسین صاحب کی مشترکہ تحریک کا بلیو پرنٹ ہے جو یہ دونوں رشید صاحب کی وفات سے چند سال قبل سوچ رہے تھے اور بڑی تفصیل سے سوچ رہے تھے۔ تحریک کے خدوخال کبھی ریکارڈ پر تو نہیں آئے لیکن ڈرافٹ بنتے رہتے تھے جو مسودہ کی شکل میں ممکن ہے کبھی دستیاب ہو جائیں۔

دل کی گواہی پر کیا خوبصورت جملے ہیں!

☆☆☆

74

سنیچر،
۱۲رمئی ۱۹۷۳ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

محبّ مکرم، تسلیم

نوازش نامہ مورخہ ۱۹ اکل صادر ہوا۔ یادفرمائی سے خوش اور شکر گزار ہوا۔ آپ کے انگریزی مضامین کا شائع ہونا بہت مناسب ہوگا۔ آپ کا مطالعہ، وسعت نظر اور ہمدردی آپ کو اس کا مستحق ہی نہیں بناتی کہ آپ علی گڑھ پر لکھیں بلکہ اس کو آپ پر بطور ایک فریضہ کے عائد کرتی ہے۔

کچھ دنوں سے علی گڑھ طرح طرح کے مکروہات کی زد میں ہے، ان کو دیکھتے ہوئے کیسے کہوں کہ آپ کے اس ارادے کو یہاں کتنی اور کیسی تقویت مل سکے گی۔ لیکن آپ اپنے ارادے کو ملتوی نہ کریں بلکہ اس پر اچھی طرح نظر ثانی کرلیں اور کئی کاپیاں ٹائپ کرلیں۔ اس پر ایک مسبوط مقدمہ لکھ دیں۔ کسی مستند اور مشہور شخص سے تعارف لکھالیا جائے گا۔ اس کے بعد اس کی طباعت اور اشاعت کا اہتمام کیا جائے گا، ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے۔ آپ اپنا کام شروع کر دیجئے۔ میری صحت اچھی نہیں ہے۔ باہر نکلنا تو درکنار گھر کے اندر بھی چلنا پھر دشوار ہوتا ہے۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

☆☆☆

75

بدھ،
۱۹؍ستمبر۱۹۷۳ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

محبّ مکرم، تسلیم

۱۵؍کا نوازش نامہ ۱۷؍کو مل گیا تھا۔ عرصے سے طبیعت اچھی نہیں رہتی۔ طرح طرح کی تکالیف اور معذوریوں نے اس لائق نہیں رکھا کہ اطمینان سے زندگی کے معمولات پورے کرسکوں۔ لکھنا پڑھنا بھی تقریباً بند ہے یا برائے نام رہ گیا ہے۔ آپ نے جو کاغذات بھیجے ہیں ان کو بڑی مشکل سے پڑھ پایا، وہ بھی صرف جہاں تہاں سے۔ ایسے میں آپ کو کیا جواب دوں۔ مسلمان اور ان کے اداروں سے جیسی دشمنی دوسروں میں پھیلی ہوئی ہے، وہ اتنی جڑ پکڑ چکی ہے کہ اس کا مقابلہ ہمارے آپ کے بس کا نہیں رہا۔ صرف اتنا ممکن رہ گیا ہے کہ اپنے اپنے طور پر صلح و شرافت سے کام لیتے رہیں اور اچھے وقت کے منتظر رہیں۔ آپ میں صلح و شرافت کے صفات غالب ہیں۔ لکھنے پر بھی اللہ نے بڑی قدرت دی ہے۔ دعا ہے کہ آپ ان صفات سے کام لیتے رہیں۔

فرمایئے تو مرسلہ کاغذات (اردو مسودے) واپس بھیج دوں۔ آپ نے ان کو بڑی محنت سے ترتیب دیا ہے اس لیے ایسا چاہتا ہوں۔ دعا ہے کہ آپ خوش و خرم ہوں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

☆☆☆

76

منگل

۲۵؍ستمبر۱۹۷۳ء

ذاکر باغ،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

بھٹنا گر صاحب مکرم،تسلیم

۲۱؍کا پوسٹ کارڈ کل صادر ہوا۔ آپ کے مسودے کا انتظام کر دیا ہے۔امید ہے کہ کام آپ کی پسند کے مطابق ہو جائے گا۔ممکن ہے کچھ دیر لگ جائے۔تردد نہ کیجئے گا۔حالات بدستور ہیں۔

دعا ہے کہ آپ خوش وخرم ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

☆☆☆

77

سنیچر
۱۶؍فروری ۱۹۷۴ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ
بھٹنا گر صاحب محترم، آداب

مبارک باد کا نوازش نامہ (مورخہ ۱۳؍) کل شام صادر ہوا۔ نہایت درجہ خوش اور شکر گزار ہوا، اتنا جتنا آپ کی طرح کے مخلص اور دیرینہ دوست کی طرف سے نصیب ہوسکتا تھا۔ آپ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ ایسا تہنیت نامہ کسی انبار میں گم ہوسکتا ہے۔ وہ تو دلوں میں تازہ اور روشن رہے گا۔

دعا ہے کہ آپ اور متعلقین خوش و خرم اور تندرست ہوں اور رہیں، بالخصوص اس زمانے میں جب ہر طرف ہر طرح کی افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

مبارک باد غالباً پدم شری کے قومی اعزاز کی رہی ہوگی۔

☆☆☆

78

۱۴؍ستمبر۱۹۷۴ء
ذاکر باغ،علی گڑھ یونیورسٹی
علی گڑھ

محبی ومکرمی،تسلیم

۱۰؍کا کارڈ ابھی ملا۔ یاد فرمائی کا شکر گذار ہوں۔ یہ معلوم کر کے بہت خوش ہوا کہ علی گڑھ کے احباب کو آپ بھولے نہیں ہیں۔اور ان کی یاد آپ کے لیے تسکین وتقویت کا باعث رہتی ہے۔

میری صحت خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے۔اور یہ نہ تعجب کی بات ہے نہ تردد کی۔ بہت جیا۔**اپنے سے کم عمر اور بہتر احباب اور عزیزوں کی رحلت یاد آتی ہے تو اپنے جینے سے غیرت آنے لگتی ہے**۔ ہر زیادہ عمر پانے والوں کا یہی احساس ہوتا ہے۔

غالب کا جو مصرعہ آپ نے لکھا ہے وہ یوں ہے :

ع رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

البتہ آپ نے اس کا استعمال برمحل کیا ہے۔سب کو ما وجب۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

☆☆☆

79

بدھ،
یکم جنوری ۱۹۷۵ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

محبّ مکرم، تسلیم

نوروز کی تہنیت صادر ہوئی۔ آپ نے ایسے مبارک موقعے پر یاد رکھا اس سے اتنی خوشی ہوئی اور تقویت ملی اس کا اندازہ میں اور آپ دونوں کر سکتے ہیں۔

دعا ہے کہ آپ خوش اور تندرست رہیں اور اچھے کاموں میں مصروف اور منہمک۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

☆☆☆

80

۸/جنوری ۱۹۷۶ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بھٹنا گر صاحب مکرم و محترم، آداب

۳۰/دسمبر ۷۵ء کا والا نامہ کل ۷/کو صادر ہوا، معلوم نہیں کیوں اتنی دیر ہوئی اور کہاں ہوئی۔ یہ سن کر تردد ہوا کہ پیٹ کی تکالیف سے آپ کو آپریشن کرانا پڑا۔ ایسے حادثے پیش آتے ہی رہتے ہیں، البتہ یہ خدا کا کرم ہے کہ تکلیف سے نجات ہو جاتی ہے اور مریض ہنسی خوشی پھر عزیزوں اور دوستوں سے آملتا ہے۔ مبارک ہو، اس کے ساتھ سال نو بھی۔

میری طبیعت کچھ دنوں سے زیادہ خراب رہنے لگی ہے۔ طرح طرح کی تکالیف کا سامنا ہے لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اب یہی سب ہوتا رہے گا تا آنکہ **ایک دن**.....

اچھے ہو جائیں تو ایک اچھے شغل کے طور پر علی گڑھ یونیورسٹی کی تاریخ مرتب کر ڈالیے۔ یہ آپ پر قرض ہے جسے آپ کو چکانا ہے۔ امید ہے آپ اسپتال سے آکر زندگی کے معمولات میں مصروف ہو گئے ہوں گے۔

کمال سلام لکھاتے ہیں۔ احسان سے ایک مدت سے ملنا نہیں ہوا۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

کارڈ کا تھوڑا حصہ پھٹا ہوا ہے۔

☆☆☆

81

۲۱/مارچ

حضرت!

جی نہیں۔ہم دونوں اکٹھا نہیں ہو سکتے۔ایک مہینہ ہوا میں نے گورنمنٹ میں بھیجنے کے لیے ایک تصویر کھنچوائی تھی وہ نذر کر دوں گا۔خاں صاحب کا فوٹو علیحدہ لیجئے۔بقیہ تمام پروگرام سر آنکھوں پر۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

.....

یہ رقعہ بھٹنا گر صاحب کے خط کے جواب میں ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

جناب صدیقی صاحب-آداب۔پچھلے اتوار کو میری لڑکی اور داماد آ گئے اور اب پرسوں صبح واپس چلے جائیں گے کئی روز سے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے تھے لیکن صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے، وعدہ پورا نہیں ہوتا۔یہ بن بلائے مہمان آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں، آج شام کو، تاکہ آپ کا اور خاں صاحب کا فوٹو لے سکیں۔کیمرہ لائے ہیں۔خاں صاحب اور آپ کا یکجا ہونا ضروری ہے۔فرمائیں تو ہم لوگ قریب ۴/بجے شام کے حاضر ہو جائیں اور خاں صاحب سے بھی اجازت لے لیں۔چائے پر آئیں گے اور خاں صاحب کا پان اور آپ کی تمباکو کی گولیاں اگر مل جائیں تو زہے نصیب۔

خاکسار

ش.ک. بھٹ

☆☆☆

82

۳۱/دسمبر

بھٹناگر صاحب مکرم، تسلیم

تعمیل ارشاد میں اسٹینسل بن گیا، دو شعر شامل کر دیئے گئے ہیں، لیکن اس میں آپ کا تعلق **سرشانتی سروپ** بھٹناگر مرحوم سے کہاں آیا، آپ تو فرماتے تھے ایک پیراگراف بڑھا دیں گے۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

ہمارے بھٹناگر صاحب سرشانتی سروپ کے نواسے سمجھ لیجئے، ویسے اصل رشتہ مرزا غالب والے ہرگوپال تختہ سے تھا۔ سرشانتی مشہور سائنٹسٹ تھے، اردو میں بھی لکھتے تھے، ان کی ایک مثنوی یاد آتا ہے انجمن ترقی اردو نے بھی چھاپی تھی۔

☆☆☆

83

یکم دسمبر

ڈیر بھٹناگر صاحب، تسلیم

جن صاحبوں کا آپ کے تبادلے کو روکنے میں دخل ہوسکتا تھا ان کے نام آپ نے لکھ کر بھیج دیئے تھے اسی دن میں نے اپنے ایک عزیز دوست کو لکھا کہ وہ اس سلسلے میں کوشش شروع کر دیں۔ آج ان کا خط آیا کہ فلاں صاحب سے شناسائی نہیں ہے اور آج کل الیکشن کے بخار سے کسی کے حواس بجا نہیں ہیں۔ لوگ کہاں کہاں مارے پھر رہے ہیں تو ایک دوسرے معتمد دوست یاد آئے کہ ان کو لکھوں۔ ان کا اثر بھی ہے۔ اب آپ کہتے ہیں کہ شام کو اس پر تبادلۂ خیالات ہوگا تو میں شام کو کہیں آتا جاتا نہیں آپ سے ملاقات کیسے ہوگی، دوسرے یہ کہ وقت نکل جائے گا تو دوڑ دھوپ سے کیا فائدہ۔ آج فرائیڈے، جمعہ ہے۔ کل خط پہنچ جاتا ورنہ دوشنبہ کو پہنچے گا۔ اور کسے کیا معلوم کہ دیر ہو جانے میں کیا ہو جاتا ہے۔

حبیب احمد صدیقی صاحب کا پتہ آپ کو معلوم ہے جو حال میں نینی تال میں کمشنر تھے اور اب لکھنؤ میں ہیں۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

یہ خط غالباً ۱۹۶۰ء کے آس پاس کا ہوگا۔

☆☆☆

84

۲۵/مارچ

مجی، میرا آنا تو ہولی کے دن سے مجھ پر واجب الادا ہے لیکن اپنی معذوری کو کیا کہیے۔ ممکن ہے آج شام حاضر ہوسکوں، تو پھر گفتگو کروں گا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

یہ خط بھٹناگر صاحب کے خط کی پشت پر ہی لکھ دیا گیا تھا۔ بھٹناگر صاحب کا خط مندرجہ ذیل ہے:

''جناب صدیقی صاحب آداب، کل شام کو آپ کا انتظار رہا۔ حسب وعدہ جناب Towel صاحب کے بارے میں کچھ لکھا ہے وہ جناب کو دکھانا تھا۔ اگر ہوسکا تو کل حاضر ہوں گا۔ یا اگر شام کو فرصت ہو تو حاضر ہوں۔ پورا chapter ابھی مکمل نہیں ہوسکا ہے۔ لیکن اس مہینے کے ختم تک ضرور پورا ہو جائے گا۔

آداب
کمترین شام کرشن''

اس خط کی تاریخ کا تعین نہ ہوسکا امکان ہے کہ بھٹناگر صاحب کے ورود کے ابتدائی زمانے ہی کا ہو۔ مگر اس امکان کے موثق ہونے تک، اسے آخر میں ہی رکھنا مناسب ہوگا۔

☆☆☆

خطوط کی تاریخیں

۱۳نومبر۱۹۶۰ء

۵دسمبر۱۹۶۰ء

۳۰/۳۱دسمبر۱۹۶۰ء

۱۵اپریل۱۹۶۱ء

۱۹ستمبر۱۹۶۱ء

۱۱مارچ۱۹۶۳ء

۲ستمبر۱۹۶۳ء

۷ستمبر۱۹۶۳ء

۹فروری۱۹۶۴ء

۲۶فروری۱۹۶۴ء

۱۶اپریل۱۹۶۴ء

۱۰ستمبر۱۹۶۴ء

۲۲ستمبر۱۹۶۴ء

۱۸اکتوبر۱۹۶۴ء

یکم نومبر۱۹۶۴ء

۲۴دسمبر۱۹۶۴ء

۲۴جولائی۱۹۶۸ء

۳اگست۱۹۶۸ء

۵ستمبر۱۹۶۸ء

۱۰ستمبر۱۹۶۸ء

۲۵ستمبر۱۹۶۸ء

۲۵اکتوبر۱۹۶۸ء

۲۴فروری۱۹۶۹ء

یکم مارچ۱۹۶۹ء

۷مارچ۱۹۶۹ء

۲۸اپریل۱۹۶۹ء

۹مئی۱۹۶۹ء

۱۵جون۱۹۶۹ء

۵جولائی۱۹۶۹ء

۱۳دسمبر۱۹۶۹ء

۸جنوری۱۹۷۱ء

۱۳فروری۱۹۷۱ء

۱۶فروری۱۹۷۲ء

۲۳فروری۱۹۷۲ء

۳مارچ۱۹۷۲ء

۱۰مارچ۱۹۷۲ء

۲جون۱۹۷۲ء

۲۴ستمبر۱۹۷۲ء

۳۰ستمبر۱۹۷۲ء

۱۲مئی۱۹۷۳ء

۱۹ستمبر۱۹۷۳ء

۲۵ستمبر۱۹۷۳

۱۶فروری۱۹۷۴ء

۱۴ستمبر۱۹۷۴ء

یکم جنوری۱۹۷۵ء

۸جنوری۱۹۷۶ء

☆

۲۵مارچ (سال غائب)

☆

فہمیدہ ریاض

از
ڈاکٹر غلام شبیر رانا
ڈاکٹر محمد اسلام خاں
ڈاکٹر سعدیہ اقبال

ڈاکٹر غلام شبیر رانا

فہمیدہ ریاض

سلطانیٔ جمہور ،انسانی حقوق اور خواتین کے حقوق کی علم بردار ترقی پسند ادیبہ فہمیدہ ریاض 21۔نومبر 2018 کی شب لاہور میں خالق حقیقی سے جا ملیں ۔ وہ اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے کراچی سے لاہور پہنچی تھیں ۔بائیس نومبر 2018 کو ان کی نماز جنازہ جامع مسجد عسکری، لاہور میں ادا کی گئی اور بہار شاہ شہر خموشاں(لاہور) کی خاک نے ترجمہ نگاری ، تانیثیت ،جرأتِ اظہار ،انقلابی شاعری،ترقی پسند سوچ اور حریتِ فکر کے ہمالہ کی ایک سر بہ فلک چوٹی کو ہمیشہ کے لیے اپنے دامن میں چھپالیا۔فہمیدہ ریاض نے اپنے اسلوب میں پامال راہوں اور عام روش سے ہٹ کر اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کو شعار بنایا ۔ایک زیرک،فعال ، جری اور حریتِ ضمیر سے جینے کی آرزومند ادیبہ کی حیثیت سے فہمیدہ ریاض نے ان موضوعات پر بھی کھل کر لکھا جو خواتین کے لیے بالعموم شجر ممنوعہ سمجھے جاتے ہیں۔فہمیدہ ریاض نے اٹھائیس جولائی1946 کو میرٹھ (اتر پردیش، بھارت)میں ایک علمی و ادبی گھرانے میں اپنے ننھیال میں جنم لیا۔ان کے والد ریاض احمد کا تعلق شعبہ تعلیم سے تھا اور ان کا شمار اپنے عہد کے ممتاز ماہرین تعلیم میں ہوتا تھا جو سال 1930 میں حیدر آباد سندھ میں ہجرت کر گئے تھے۔چار سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تو والدہ حسنہ بیگم نے ایک ذہین منتظم کی حیثیت سے گھر کا انتظام سنبھالا اور اپنی ہونہار بیٹی کی بہترین تربیت کی۔فہمیدہ ریاض نے میٹرک کا امتحان سندھ یونیورسٹی سے پاس کیا اور پورے سندھ میں پہلی پوزیشن حاصل کی ۔فہمیدہ ریاض کی مادری زبان اردو تھی اس لیے بچپن ہی سے انھیں اردو شاعری کا بہت شوق تھا ۔جب وہ پندرہ برس کی تھی تو اس کی پہلی نظم احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں شائع ہونے والے رجحان ساز ادبی مجلّہ فنون میں شائع ہوئی۔ بی۔اے کی تعلیم کے لیے فہمیدہ ریاض نے زبیدہ گرلز کالج حیدر آباد (سندھ) میں داخلہ لیا۔اس کے بعد انھوں نے سیاسیات میں ایم۔اے کرنے کے لیے جامعہ سندھ میں داخلہ لیا۔

فہمیدہ ریاض نے ریڈیو پاکستان سے نیوز کاسٹر کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ بائیس برس کی عمر میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''پتھر کی زبان'' منظر عام پر آیا۔فہمیدہ ریاض نے زمانہ طالب علمی میں سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیا ۔اس کی پرجوش تقاریر پتھروں سے بھی اپنی تاثیر کا لوہا منوا لیتی تھیں ۔ پاکستان میں صدر ایوب کے دور حکومت (1958-1969) میں نافذ ہونے والے یونیورسٹی آرڈی ننس ،پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی ننس، فیملی لا آرڈی ننس اور ایبڈو کے خلاف فہمیدہ ریاض نے بائیں بازو کی طلبا تنظیموں سے مل کر بھر پور احتجاج کیا۔سال 1984 میں ضیاء الحق کے دور میں مارشل لا آرڈر کے تحت طلبا کی یونینز پر پابندی پر بھی فہمیدہ ریاض نے سخت تنقید کی ۔گریجویشن کرنے کے بعد سال 1967 میں فہمیدہ ریاض نے اپنے خاندان کی مرضی سے صابر علی ہاشمی سے شادی کر لی اور شوہر کے ہمراہ برطانیہ چلی گئیں۔لندن میں اپنے شوہر کے ساتھ قیام کے دوران میں وہ کچھ عرصہ ایک کتب خانے میں معاون کے طور پر خدمات پر مامور رہیں ۔برطانیہ میں قیام کے دوران میں انھوں نے برطانیہ کے نشریاتی ادارے بی بی سی اردو سروس میں نیوز کاسٹر کی حیثیت سے ملازمت کی۔اس کے ساتھ ہی اپنی تعلیم بھی جاری رکھی اور لندن فلم سکول سے فلم کی تیاری کے کورس میں ڈگری حاصل کی۔ اس شادی سے ان کی ایک بچی (سارہ) پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی شوہر نے طلاق دے دی۔ سارہ ان دنوں امریکہ میں مقیم ہے ۔اپنے پہلے شوہر سے طلاق ملنے کے بعد فہمیدہ ریاض سال 1973 میں واپس پاکستان چلی آئیں اور کراچی میں ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں ملازم ہو گئیں ۔جلد ہی انھوں نے اپنے ذاتی ادبی مجلّہ'' آواز'' کی اشاعت کا آغاز کر دیا۔ جبر کے ماحول میں جب متاع لوح وقلم چھین لی گئی تو''آواز'' کی مجلس ادارت نے جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا شعار بنا لیا۔کراچی میں ان کی ملاقات بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے فعال اور مستعد سیاسی کارکن اور سندھی قوم پرست ظفر علی اجن سے ہوئی۔باہمی رضا مندی سے دونوں نے شادی کر لی ۔ظفر علی اجن کی کتاب''Bhutto Speaks from the Grave'' کا پہلا ایڈیشن سال 1983 میں شائع ہوا جب کہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن سال 2007 میں شائع ہوا۔

فہمیدہ ریاض کی اس دوسری شادی سے ایک بیٹی ویرتا علی اجن اور ایک بیٹا کبیر علی اجن پیدا ہوئے ۔ ویرتا علی اجن بڑی ہے جب کہ کبیر علی اجن چھوٹا ہے ۔حریت فکر کے علم

بردار ادیبوں کے مجلّہ'' آواز'' میں شائع ہونے والے مضامین کومقتدر حلقو ں نے نا پسند کیا ۔ مجلّہ'' آواز'' کی مجلس ادارت زیرعتاب آ گئی حکومتی احکامات کے تحت مجلّہ کی اشاعت کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔اس مجلّے کے صرف آ ٹھ شمارے شائع ہو سکے۔ اس کے بعد صدر ضیاء الحق کی حکومت نے فہمیدہ ریاض اور ان کے شوہر کی گرفتاری کے احکامات صادر کر دیئے۔اس کے بعد مجلّہ ''آواز'' کے خلاف چودہ (14)مقدمات درج کر لیے گئے۔ ان مقدمات سے ایک 124-A پاکستا ن پینل کوڈ بھی تھا ،جس کے تحت مجلّہ کی مجلس ادارت کوکسی دشمن ریاست سے ساز باز کرنے اور غداری کی بنا پر سزائے موت بھی ہوسکتی تھی۔فہمیدہ ریاض کا کہنا تھا کہ بے بنیاد الزامات کے تحت قائم ہونے والے فرضی مقدمات کے باعث یاس و ہراس کی ایسی فضا پید ا ہوگئی کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ صحنِ چمن پر موت کے سائے منڈلانے لگے ہیں۔گرفتاری سے پہلے فہمیدہ ریاض نے ضمانت کرا لی مگر ان کے شوہر ظفر علی اجن کو جیل بھیج دیا گیا۔ اس اعصا ب شکن ماحول سے پریشان ہو کر فہمیدہ ریاض ایک عالمی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے امریتا پریتم (Amrita Pritam:1919-2005) کی مشاورت سے اپنے دونوں بچوں ویرتا علی اجن اور کبیر علی اجن اور اپنی بہن کے ہمراہ بھارت چلی گئیں اور وہیں خود ساختہ جلاوطنی اختیار کر لی ۔جیل سے رہائی ملنے کے بعد فہمیدہ ریاض کے شوہر بھی اپنے اہلِ خانہ کے پاس بھار ت پہنچ گئے۔خود ساختہ جلاوطنی کے عرصے میں ا س خاندان کو بھارتی حکومت کی طرف سے سہولتیں فراہم کی گئیں۔ بھارت میں مقیم فہمیدہ ریاض کے رشتہ داروں نے بھی مقدور بھر اس خاندان کی مدد کی ۔فہمیدہ ریاض کے خاندان نے سات برس(مارچ 1981 تا دسمبر 1987) بھارت میں قیام کیا ۔جلا وطنی کے عرصے میں فہمیدہ ریاض نے سال 1920 میں روشنی کا سفر شروع کرنے والی بھارت کی پبلک سیکٹر کی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں سکونتی شاعرہ (poet in residence) کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیں۔اس کے ساتھ ساتھ فہمیدہ ریاض کو جواہرلعل یونیورسٹی میں ریسرچ فیلو(Senior Research Fellow) بھی مقرر کیا گیا۔بھارت میں اپنے قیام کے عرصے میں فہمیدہ ریاض نے پس نو آبادیاتی دور کے ادب کے سلسلے میں بھارتی وزیر اعظم کے مشیر کی حیثیت سے بھی خدمات انجا م دیں۔ اسی عرصے میں ہندوستان کی 3500 سال قدیم زبان سنسکرت بھی سیکھی اور اس زبان کے ادب کا وسیع

مطالعہ کیا ۔اپنی شاعری میں فہمیدہ ریاض نے دنیا بھر کی خواتین کو حوصلے اور عزم و ہمت سے کام لیتے ہوئے منزلوں کی جستجو جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔الجیریا میں نو آبادیاتی دور کے مسائل پر فہمیدہ ریاض کی گہری نظر تھی ۔پس نو آبادیاتی دور سے تعلق رکھنے والے اردو ادب کے موضوعات پر گزشتہ صدی کے ساتویں اور آٹھویں عشرے میں جن خواتین نے کھل کر لکھا ان میں فہمیدہ ریاض کا نام نمایاں ہے ۔ان کی نظمیں ان کی سوچ کی آئینہ دار ہیں ۔ان کے اسلوب میں معاشرتی زندگی کے مسائل کی عکاسی کی گئی ہے اور وہ ایک ایسی جری عوامی ادیبہ کی حیثیت سے سامنے آئیں جس نے درِ کسریٰ کے سامنے صدا کرنے اور جبر کے سامنے سپر انداز ہونے سے انکار کر دیا۔

سال 1988 میں جب پاکستان میں سلطانیٔ جمہور کا دور آیا تو فہمیدہ ریاض بھی اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان چلی آئیں۔بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت (1988-1990) میں فہمیدہ ریاض نیشنل بک کونسل (موجودہ نیشنل بک فاؤنڈیشن) کے مینجنگ ڈائریکٹر کے منصب پر فائز رہیں۔ بے نظیر بھٹو کے دوسرے دورِ حکومت (1993-1996) میں فہمیدہ ریاض وزارتِ ثقافت سے وابستہ رہیں ۔فہمیدہ ریاض نے گیارہ برس (2000-2011)اردو ڈکشنری بورڈ کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اکسفرڈ یونیورسٹی نے بہ حیثیت مشیر فہمیدہ ریاض کی خدمات سے استفادہ کیا۔فہمیدہ ریاض نے پاکستانی خواتین کے حقوق کے لیے''وعدہ'' کے نام سے ایک NGO قائم بھی کی۔''وعدہ'' نے پس ماندہ طبقے کی خواتین سے جو عہدِ وفا استوار کیا اسی کو علاج گردشِ لیل و نہار سمجھتے ہوئے فہمید ریاض نے زندگی بھر اپنی جد و جہد جاری رکھی۔فہمیدہ ریا ض نے پس نو آبادیاتی دور میں خواتین کے مسائل پرتوجہ مرکوز رکھی۔فلسطین سے تعلق رکھنے والے کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر ایڈورڈ سعید Edward Said: (1935-2003) کی ان تحریروں کو ہمیشہ سراہا جو انھوں نے پس نوآبادیاتی ادب کے بارے لکھیں۔وہ سمجھتی تھیں کہ تہذیب اور ثقافت میں کسی قسم کے تصادم کا کوئی اندیشہ نہیں ۔ فطرت کے تقاضوں کے مطابق تہذیب و ثقافت کو کبھی گہن نہیں لگ سکتا۔ جہاں سے کوئی شاخ ٹوٹتی ہے وہیں سے کسی نئی شاخ کو نمو ملتی ہے ۔تہذیب و ثقافت کے ارتقا کا سلسلہ ازل سے جاری ہے اور اسے ہر عہد میں نمو ملتی رہے گی۔

اس جان لیوا صدمے نے ظفر علی اجن اور فہمیدہ ریاض کی روح کو زخم زخم کر دیا ۔

پیہم سات سال تک اپنے بیٹے کی صورت دیکھنے کو ترسنے والے باپ نے جب اپنے بیتے کی دائمی مفارقت کی خبر سنی تو وہ زندہ در گور ہو گیا۔ نوجوان بیٹے کی وفات کے بعد فالج کے ایک حملے نے ظفر علی اجن کو بستر تک محدود کر دیا۔ تقدیر کا یہ زخم سہنے کے بعد فہمیدہ ریاض کی زندگی کا سفر تو افتاں و خیزاں کٹ گیا مگر اس کا پورا وجود کرچیوں میں بٹ گیا۔تقدیر کے لگائے ہوئے صدمات کے ایسے گہرے گھاؤ سہنے کے بعد کارِ جہاں کے ہیچ ہونے اور فرصتِ زندگی کے انتہائی کم ہونے کے بارے میں کوئی ابہام نہیں رہتا۔

فہمیدہ ریاض کا آخری شعری مجموعہ'' تم کبیر ۔۔۔۔۔'' جو سال 2015-2000 کے عرصے کی شاعری پر مشتمل ہے ۔اکسفر ڈ یونیورسٹی پریس کے زیر اہتمام شائع ہونے والے اس شعری مجموعے کا تعارف مسعود اشعر نے لکھا ہے۔'' شعری مجموعہ ''تم کبیر ۔۔۔۔'' میں فہمیدہ ریاض کی ذہنی کیفیت اور داخلی کرب نمایاں ہے۔اپنے اس شعری مجموعے (تم کبیر ۔۔۔'') کی اشاعت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فہمیدہ ریاض گلو گیر لہجے میں کہا کرتی تھیں :

'' پہلے میں اس کا نام رکھنا چاہتی تھی'' موسموں کے دائرے میں'' لیکن پھر جیسے کہ میں نے لکھا ہے کہ میرا بیٹا ایک حادثے میں مجھے چھوڑ گیا، اس کا نام کبیر تھا ۔تو بس پھر اس کے بعد اس مجموعے کا نام بھی بدل گیا '' تم کبیر.....'' بن گیا اس کا نام۔ پہلے میں سوچتی رہتی تھی میں کبیر کی کوئی یادگار قائم کروں ،کچھ کروں ،کچھ کروں وہ سب یادگار میں قائم نہیں کر سکی۔نہ مجھ میں اتنی ہمت رہ گئی تھی نہ اتنی طاقت رہ گئی تھی مگر جو میں کر سکتی تھی وہ یہ کہ اپنی آخری کتاب کا نام میں نے'' تم کبیر ۔۔۔'' رکھ دیا۔تو اب جب بھی فہمیدہ ریاض کی کتابوں کا ذکر آئے گا تو '' تم کبیر.....'' کا بھی ذکر آجائے گا۔''

''تم کبیر.....'' کی ایک نظم ''نئی ڈکشنری.....'' زندگی کی حقیقی معنویت کو سامنے لاتی ہے۔اس نظم کی چند سطور پیش ہیں:

بناتے ہیں ہم ایک فرہنگِ نو — جس میں ہر لفظ کے سامنے درج ہیں
وہ معانی جو ہم کو نہیں ہیں پسند — جرعۂ تلخ کی مثل پی جائیں گے
اصل کی اصل جو بس ہماری نہیں — سنگ سے پھوٹتا آبِ حیواں ہے یہ
جو ہمارے اشارے پہ جاری نہیں — ہم فسردہ چراغ اِک خزاں دیدہ باغ
زخم خوردہ اناؤں کے مارے ہوئے — اپنی توصیف حد سے گزارے ہوئے

نوجوان اولاد کی دائمی مفارقت کا صدمہ بوڑھے والدین کو زندہ درگور کر دیتا ہے ۔ اس عہدِ نا پرساں میں جسے دیکھو اپنی فضا میں سرمست دکھائی دیتا ہے ۔ یہاں غم زدوں کی چشمِ تر کو دیکھنے والے مسیحا عنقا ہیں ۔دل وجگر سے بہنے والے آنسوؤں کی برسات کے نتیجے میں تلخیٔ حالات، الم نصیب خاندان پر دنیا کی عنایات کے بارے میں کئی سوالات اُٹھتے ہیں یکم دسمبر 2018 کو محترمہ کشور ناہید نے روزنامہ جنگ ،لاہور میں شائع ہونے والے اپنے کالم'' کوتوال کو للکارتی فہمیدہ ریاض'' میں جان لیوا صدمات سے دوچار ادیبوں کی کتابِ زیست میں تقدیر کے لکھے لرزہ خیز واقعات اور اعصاب شکن سانحات کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ لمحۂ فکریہ ہے :

'' تقابل کیجیے فلم سنسر بورڈ پنجاب کی چیئر پرسن محترمہ زیبا محمد علی گھر بیٹھے دس لاکھ روپے مہینہ حاصل کر رہی تھیں۔فہمیدہ ریاض اور خالدہ حسین اسپتالوں کے چکر لگا رہی تھیں ۔دونوں کی بیماری ایک ہی غم تھا.....ان دونوں کو بیٹوں کا غم کھا گیا ۔''

فہمیدہ ریاض کا شمار پاکستان میں تانیثیت کی بنیاد گزار ترقی پسند خواتین میں ہوتا ہے۔فہمیدہ ریاض سے مل کر زندگی سے پیار ہو جاتا تھا۔زندگی بھر خواتین کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والی اس انتہائی باہمت اور پرعزم ادیبہ نے تانیثیت کے بارے میں جو واضح موقف اختیار کیا وہ تاریخ کا ایک معتبر حوالہ ہے۔ یہاں تانیثیت کا تاریخی تناظر میں مطالعہ مناسب رہے گا۔

فہمیدہ ریاض کا خیال تھا کہ عالمی ادبیات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ ہر عہد میں مفکرین نے وجود زن کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں رنگ، خوشبو اور حسن وخوبی کے تمام استعارے وجودِ زن سے منسوب چلے آرہے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو عصر حاضر میں تانیثیت کو ایک عالمی تصور کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے ۔ علامہ اقبال نے خواتین کے کردار کے حوالے سے لکھا ہے :

وجود زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اِس کی — کہ ہر شرف ہے اِسی درج کا در مکنوں
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن — اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطون

دنیا بھر کی خواتین کے لب ولہجے میں تخلیقِ ادب کی روایت خاصی قدیم ہے ۔ ہر زبان کے اَدب میں اس کی مثالیں موجود ہیں ۔ فہمیدہ ریاض نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ نوخیز بچے کی پہلی تربیت اور اخلاقیات کا گہوارہ آغوش مادر ہی ہوتی ہے ۔ اچھی مائیں قوم کو

معیار اور وقار کی رفعت میں ہم دوش ثریا کر دیتی ہیں ۔ انہی کے دم سے امیدوں کی فصل ہمیشہ شاداب رہتی ہے۔ یہ دانہ دانہ جمع کر کے خرمن بنانے پر قادر ہیں تا کہ آنے والی نسلیں فروغِ گلشن اور صوت ہزار کا موسم دیکھ سکیں۔ خلوص و دردمندی ،ایثار و وفا،صبر و رضا ، قناعت اور استغنا خواتین کا امتیازی وصف ہے۔

فہمیدہ ریاض نے مردوں کی بالادستی اور غلبے کے ماحول میں بھی حریت فکر کی شمع فروزاں رکھی ااور جبر کا ہر انداز مسترد کرتے ہوئے آزادیٔ اظہار کو اپنا نصب العین ٹھہرایا۔ان کی ذہانت، نفاست، شائستگی، بے لوث محبت اور نرم و گداز لہجہ ان کے اسلوب کا امتیازی وصف قرار دیا جا سکتا ہے ۔انھیں اپنے آنسو ہنسی کے خوش رنگ دامنوں میں چھپانے کا قرینہ آتا تھا۔ ان کی سدا بہار شگفتگی کا راز اس تلخ حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ معاشرتی زندگی کو ہجوم یاس کی مسموم فضا سے نجات دلائی جائے اور ہر طرف خوشیوں کی فراوانی ہو۔

تخلیقی کام: پتھر کی زبان،گوداری(ناول) ،خطِ مرموز،کراچی (ناول)، زندہ بہار (ناول)، کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے،گلابی کبوتر،دھوپ،بدن دریدہ، کھلے دریچے سے،حلقہ میری زنجیر کا،آدمی کی زندگی،ادھورا آدمی(جرمنی میں پیدا ہونے والے امریکی مارکسی ماہر نفسیات ایرک فرام (Erich Fromm:1900-1980) کے تجزیاتی مطالعہ پر مبنی)،قافلے پرندوں کے، پاکستان ،ادب اور معاشرہ، یہ خانۂ آب و گل، سب لعل و گہر(کلیات فہمیدہ ریاض) سال اشاعت ۲۰۱۱، قلعۂ فراموشی۔

قلعۂ فراموشی کا تعلق پانچویں صدی عیسوی کے سب سے پہلے سوشلسٹ انقلابی مزد ک سے ہے ۔یہی وہ شخص ہے جس نے محنت کش طبقے کو جگا کر کاخِ امرا کے درودیوار ہلانے کی بات کی ۔ جنوب مغربی ایران کے صوبہ خوزستان کے دار الحکومت اہواز کے قریب قلعۂ فراموشی کے آثار ملتے ہیں ۔قلعہ فراموشی میں ان قیدیوں کو پابند سلاسل رکھا جاتا تھا جن کی حق گوئی مقتدر طبقے پر گراں گزرتی ۔ اس عقوبت خانے کے اسیر اپنا نام ،اپنے قبیلے کے افراد کے نام اور رہائش کا مقام تک بھول جاتے تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ اس قلعے میں موت کا عِفریت یادوں اور فریادوں کی صلاحیت سلب کر لیتا تھا ۔حریت فکر کے ایسے مجاہدوں کو حافظے کی صلاحیت سے محروم کر کے استبدادی قوتیں اس زعم میں مبتلا ہو جاتیں کہ انھوں نے تنقید کی راہیں مسدود

کر دی ہیں ۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ حریت ضمیر سے جینے والے متاع لوح وقلم چھن جانے کے بعد خون دل میں انگلیاں ڈبو کر اپنے دل کا حال زیب قرطاس کرتے رہتے ہیں ۔فسطائی جبر کے ہاتھوں جان جاتی ہے شوق سے جائے مگر حق گوئی کو شعار بنانے والے کبھی جبر کے سامنے سپر انداز نہیں ہو سکتے ۔فہمیدہ ریاض نے پاکستان کی علاقائی زبانوں کے ادب میں گہری دلچسپی لی اور ان زبانوں کے ادب کا مطالعہ کیا ۔انھیں عربی، اردو ،انگریزی ، ہندی ،سندھی، برج، بلوچی، پنجابی ،پشتو اور فارسی زبان پر خلاقانہ دسترس حاصل تھی۔خواتین کے مسائل،انسانیت کا وقار اور سربلندی، حق گوئی و بے باکی، جنگ و جدال کے مسموم اثرات ، دشمنی اور عداوتوں کے تباہ کن اثرات ، تاریخ ،سیاست اور لوک ادب فہمیدہ ریاض کے پسندیدہ موضوعات تھے ۔ ترجمہ نگاری میں فہمیدہ ریاض کی خداد اد صلاحیتوں کا ایک عالم معترف ہے ۔فہمیدہ ریاض نے البانیہ سے تعلق رکھنے والے ناول نگار،شاعر اور ڈرامہ نگار اسماعیل کدرے (Ismail Kadare) کی تخلیقات کو اردو زبان کے قالب میں ڈھالا ۔ اسماعیل کدرے کا سال 1963 میں شائع ہونے والا ناول ’’ مردہ فوج کا سالار‘‘ (The General of the Dead Army)فہمیدہ ریاض کو بہت پسند تھا۔اس ناول میں اسماعیل کدرے نے البانیہ کے اس سالا ر کی داستان بیان کی ہے جس کی فوج نے ہزیمت اور پس پائی کے وقت دوسری عالمی جنگ میں زبردست جانی نقصان اٹھایا۔اسماعیل کدرے کا ایک اور معرکہ آرا ناول محصورین کا قلعہ (The Castle or The Siege)جو سال 1970 میں منظر عام پر آیا اسے اسماعیل کدرے کے جرأت مندانہ منفرد اسلوب کی پہچان سمجھا جاتا ہے ۔اس کے علاوہ اسماعیل کدرے کا سال 1977 میں شائع ہونے والامقبول ناول ’’عظیم سرما‘‘ (The Great Winter) بھی فہمیدہ ریاض کی توجہ کا مرکز رہا۔ فارسی زبان کے عالمی شہرت کے حامل ممتاز شاعر شاعرمولانا جلال الدین محمد رومی (1207-1273)کے فارسی کلام کا اردو ترجمہ کرنے کے سلسلے میں فہمیدہ ریاض کو اوّلیت کا اعزاز حاصل ہے ۔سندھی زبان کے شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی(1689-1752) اور شیخ ایاز (1923-1997) کی شاعری کا بھی فہمیدہ ریاض نے اِس مہارت سے اردو ترجمہ کیا کہ دو تہذیبوں میں سنگم دیکھ کر قاری عش عش کر اُٹھتا ہے ۔ ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد (1934-1967) کی منتخب نظموں کے تراجم پر مشتمل کتاب ’’کُھلے دریچے سے‘‘فہمیدہ ریاض کی ترجمہ نگاری کی عمدہ مثال ہے ۔

فہمیدہ ریاض کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ قحط الرجال کے موجودہ دور میں بے کمال لوگوں کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں اور اہلِ کمال کا کوئی پرسان حال نہیں۔اپنی تحریروں میں فہمیدہ ریاض نے معاشرے کے پس ماندہ طبقے بالخصوص خواتین کی حالتِ زار کو موضوع بنایا ہے ۔طالع آزما ،مہم جو عناصر ،فصلی بٹیروں ،بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے و الوں اورمرغانِ باد نما کی ریاکاری اور منافقت سے انھیں شدید نفرت تھی ۔ اس عہدِ نا پرساں میں وقت کے اس سانحہ کوکس نام سے تعبیر کیا جائے کہ یہاں جاہل اپنی جہالت کا انعام ہتھیانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔جس معاشرے میں ساغر صدیقی، ماسٹر عاشق حسین،رام ریاض، اطہر ناسک ،ضمیر نیازی(صحافی) ،اسحاق ساقی،فضل بانو،خادم مگھیانوی، نعیم آروی (افسانہ نگار) اور امیر اختر بھٹی جیسے عجز و انکسار کے پیکر تخلیق کار کسمپرسی کے عالم میں زینۂ ہستی سے اتر جائیں،اس معاشرے کی بے حسی کے بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں ۔جب کوئی معاشرہ کسی مصلحت کے تحت شقاوت آمیز نا انصافیوں اور جبر و استبداد کو سہہ کر بھی چپ سادہ لے اورٹس سے مس نہ ہو،اسے تقدیر کی منشااور قسمت کی تحریر سمجھے تو اسے ایک المیہ سمجھنا چاہیے ۔ جب معاشرہ مظلوم کی حمایت میں تامل کرے اور ظالم کے ہاتھ مضبوط کرے تو یہ بات اس معاشرے کی بے حسی کی علامت ہے ۔اس قسم کی اجتماعی بے حسی کسی بھی قوم کی بقا کے لیے انتہائی بُرا شگون ہے۔منیر نیازی (منیر احمد: 1928-2006)نے معاشرتی زندگی میں راہ پاجانے والی اس بے حسی کے بارے میں کہا تھا:

وہ بے حسی ہے مسلسل شکستِ دِل سے منیرؔ　　کوئی بچھڑ کے چلا جائے غم نہیں ہوتا

کہا جاتا ہے کہ کارواں کے دل میں احساس زیاں باقی رہ جائے تو زندگی بھر سنگ ملامت سہنے والوں کی تدفین بھی اعزاز کے ساتھ کی جاتی ہے ۔حیف صد حیف کہ فہمیدہ ریاض نے جب عدم کے کوچ کے لیے رخت سفر باندھا تو حریتِ ضمیر سے جینے کو شعار بنانے والی اس یگانۂ روزگار ادیبہ کوآنسوؤں اورآہوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے ادیب برادری نے روایتی بے حسی کا مظاہرہ کیا۔

''صرف دو ادیب جنازے میں شریک ہوئے ،محلے اورمسجد کے نمازی یا چند اعزا و اقربا'' (ذکاءاللہ شیخ)۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد اسلام خاں

فہمیدہ ریاض

ان کا تعلق یو پی کے شہر میرٹھ کے ایک ادبی خانوادے سے ہے۔ ان کی پیدائش ۲۸ جولائی 1946 کو ہوئی تھی، فہمیدہ کے والد ریاض الدین احمد کا شمار ماہرین تعلیم میں تھا، سندھ کے جدید تعلیمی نظام کے فروغ میں ان کی کوششیں نا قابل فراموش ہیں۔ سندھ میں ٹرانسفر کے بعد ان کی فیملی حیدر آباد منتقل ہوگئی، فہمیدہ ریاض بچپن میں ہی اپنے والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہوگئیں..... تعلیم پوری کرنے کے بعد ریڈیو پاکستان سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ بی بی سی (اردو ریڈیو) سے بھی وہ وابستہ رہیں۔ اسی دوران انھوں نے فلم میکنگ کی ڈگری بھی حاصل کی۔

فہمیدہ ریاض کا تعلق ترقی پسند ادب سے رہا۔ حقوق انسانی خاص طور پر عورتوں کے حقوق کے لیے وہ بے حد سرگرم رہیں۔ ان کو نسائی ادب کے نمایاں کردار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ بقول فہمیدہ ریاض، 'تانیثیت کے کئی مفاہیم ہیں مگر میرے لیے اس کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ عورت، مرد ہی کی طرح ہے۔ دونوں کے غیر محدود امکانات ہی انسانیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ دلت ور سیاہ امریکیوں کی طرح دونوں کو سماجی مساوات کے حصول کی یکساں کوشش کرنی چاہیے..... میرا مطلب ہے کہ بغیر ہراساں کیے عورت کو روڈ پر چلنے کا پورا حق ہو.....''

عورتوں کے حقوق اور ان کی آواز کو حکمراں طبقے تک پہنچانے کے لیے فہمیدہ ریاض نے 'آواز' نام کا ایک رسالہ نکالا۔ اپنی اس کوشش میں وہ بہت کامیاب رہیں۔ شوہر کے ساتھ مل کر فہمیدہ نے 'آواز' کو استحکام بخشا اور اپنی کڑی محنت سے اسے اونچائیوں تک پہنچایا۔ حکمراں طبقے کو یہ بات ناگوار لگی اور اس کے خلاف کئی کیس درج کرا دیے گئے۔ اپنے سیاسی نظریات اور غیر متزلزل ارادوں کی وجہ سے فہمیدہ کو کئی چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔ جنرل ضیاء الحق کے دور اقتدار میں ان کے خلاف تقریبا 10 مقدمات کیے گئے اور انہیں

جیل بھی ہوئی۔ ضمانت کے بعد امرتا پریتم کی مدد سے وہ اپنے دو بچوں کے ستھ ہندوستان آ گئیں اور وزیر اعظم اندرا گاندھی نے انہیں سیاسی پناہ دی۔ 7 سال انہوں نے یہیں گزارے۔ ضیاء الحق کی موت کے بعد وہ پاکستان واپس ہوئیں۔ اپنی جلا وطنی کے دوران بطور شاعرہ انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قیام کیا اور اس دوران انہوں نے ہندی سیکھ لی۔ اپنی اس مشکل گھڑی کے تجربات کو فہمیدہ ریاض نے ایک نظم میں بطور یادگار پیش کیا ہے:

ترا مجھ سے کوکھ کا ناتا ہے/ جس پر سب تن وار دیا
ہیں جن کے ہاتھ پہ انگارے/ میں ان بنجاروں کی چیری
ماں ان کے آگے کوس کڑے/ اور سر پہ کڑکتی دو پہری
میں بندی باندھوں کی باندی/ وہ بندی خانے توڑیں گے
ہے جن ہاتھوں میں ہوتھ دیا/ سو ساری سلاخیں موڑیں گے
تو سدا سہاگن ہوناری/ مجھے اپنی توڑ نبھانا ہے
رسی دلی چھوکر چرن ترے/ مجھ کو واپس مڑ جانا ہے۔

پندرہ سال کی عمر میں فہمیدہ عمر میں پہلی نظم احمد ندیم قاسمی کے رسالے فنون مین شائع ہوئی تھی۔ بائیس سال کی عمر میں ان کا شعری مجموعہ منظر عام آیا تھا، پتھر کی زبان(1982) کھٹے مرمز(2002) گوداوری، کیا تم پورا چاند نہ دیکھوگے، کراچی، گلابی کبوتر، بدن دریدہ، دھوپ، آدمی کی زندگی، کھلے دریچے سے، 1998 حلقہ میری زنجیر کا، ادھورا آدمی، پاکستانی ادب اور معاشرہ، قافلے پرندوں کے، یہ خانۂ آب وغل، سب لعل و گہر(2011)، ان کی اہم تخلیقات ہیں..... ان کے شعری مجموعہ'' اپنا جرم ثابت ہے'' میں جنرل ضیا الحق کے ظلم وستم (مبینہ) کے واقعات کو بیان کیا گیا۔ پاکستان پیوپلس پارٹی کے دور اقتدار میں فہمیدہ ریاض اردو لغت بورڈ سے وابستہ ہوئیں..... مگر انہیں یہاں زیادہ دن نہیں رہنے دیا، اور وقت سے پہلے ریٹائر کر دیا گیا، اس سے پہلے نوجوان بیٹے کی موت نے انھیں توڑ کر رکھ دیا تھا، ان کا انتقال لاہور میں 21 نومبر 2018 میں ہوا۔

(امنگ/ روزنامہ راشٹریہ سہارا، 30 دسمبر 2018)

☆☆☆

ڈاکٹر سعدیہ اقبال

نسائیت کی مضبوط آواز

میرٹھ جو تاریخ میں 1857 سے ہی بغاوت اور انقلاب کے لیے مشہور ہے۔ اس مٹی کے اتھے خمیر سے فہمیدہ ریاض جولائی 1946 میں پیدا ہوئیں۔ علم و ادب سے مزین گھرانے آپ کا استقبال کیا۔ میرٹھ اور 1946 کا ذکر کرنے کے بعد تاریخ کی رو سے پورا ماحول نظر کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ تقسیم ہند کا کبھی نہ مٹنے والا درد ہر حساس دل میں پھانس بن کر چبھ گیا۔ اسی کا شکار آپ کا خاندان پاکستان کا ہوکر رہ گیا۔ انھوں نے طالب علمی کے زمانہ سے ہی سماجی اور سیاسی مسائل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جب وہ صرف پندرہ برس کی تھیں تو ان کی پہلی نظم 'فنون' میں شائع ہوئی اور جب 22 سال کی ہوئیں تو ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے پیچھے مڑکر نہیں دیکھا، یکے بعد دیگرے کئی مجموعے شائع ہوئے۔

انھوں نے اپنی زندگی کے جو اصول بنائے، اس سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ نہایت حسین وجمیل کشادہ پیشانی بڑی بڑی روشن آنکھیں، ستواں ناک، خوبصورت پیچ وخم کھاتی زلفیں اور اس پر نہایت ہی موزوں قد، گورا رنگ اور پھر ان کے باغیانہ تیور نے لوگوں کو جو اس مزاج کے تھے ان کا گرویدہ بنا دیا۔ ایک خاص ادا سے ان کا سگریٹ پینا ہر کسی کو بھاتا تھا جب کہ ہمارے معاشرے میں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا، لیکن وہ اس عادت سے سمجھوتہ نہ کرسکیں کیوں کہ اس زمانہ مین کامریڈ اور زیڈ یونین لیڈروں کا 'کے ٹو' سگریٹ پینا گویا ٹریڈ مارک بن گیا تھا اور آپ بھی اس کا حصہ تھیں، اس کے علاوہ وہ اپنے دل کی سننے والی بھی، کچھ لوگ دنیا کے خوف، زمانہ کا لحاظ کرکے یا تو چھپ کر یہ سب کچھ کرتے ہیں یا پھر چھوڑ دیتے ہیں، لیکن فہمیدہ ریاض تو اپنی راہ کے علاوہ دوسروں کی راہ بھی متعین کرتی تھیں۔ جب بھی طالب علموں کے درمیان ہوتیں اور سگریٹ پینا ہوتا تو کہتیں معاف کرنا، میں بُری عورت ہوں اور پینا شروع کر

دیتیں۔ ان کی اس ادا پر نہ جانے کتنے اپنا دل تھام لیتے اور ان کے حسن اور انداز پر اپنی جان چھڑکتے تھے۔

فہمیدہ ریاض ایک مضبوط نسائی آواز کا نام ہے، جنھوں نے شعور سنبھالنے کے ساتھ ہی نسائیت کا علم تھام لیا تھا۔ انھوں نے جمہوریت اور نسائی حقوق کی ترقی پسند آواز کے لیے ہندو پاک کے علاوہ عالمی سطح پر بھی اپنی پہچان بنائی۔ انھوں نے تشدد، استحصال اور تانا شاہی کی مخالفت کی۔

فوجی مارشل لا اور جنرل ضیاء الحق کی حکومت کے خلاف عوامی احتجاج کا حصہ بنیں۔ صرف جلسہ جلوس میں تقریریں کرنا ان کا کام نہ تھا بلکہ عام، نوجوانوں اور عورتوں کے جذبات اور احساسات کے درد کو محسوس کرتے ہوئے گلی کوچوں اور سڑکوں پر بھی ان کے لیے آواز اٹھائی، نتیجتاً حکومت کی عتاب کا شکار ہوئیں۔ 'آواز' نام سے ایک اردو میگزین نکالی۔ 'آواز' کی بے باک تحریر نے جنرل ضیاء الحق کی حکومت اور ان کے تیور پر ضرب کاری لگائی تو فہمیدہ ریاض اور ان کے شوہر پر کئی مقدمات قائم کر دیئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا میگزین پر پابندی عائد ہوگئی۔ شوہر کو جیل ہوگئی، لیکن فہمیدہ ریاض کی ایک پرستار نے ضمانت کرادی۔ امریتا پریتم نے وزیر اعظم اندرا گاندھی کی سفارش سے فہمیدہ ریاض کو ان کے اہل خانہ سمیت ہندستان بلالیا۔ فہمیدہ ریاض نے دلی میں قیام کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ہندی مضمون میں مہارت حاصل کی۔ اسی زمانہ میں یہاں کے حالات پر اپنی مشہور فلم 'تم بالکل ہم جیسے نکلے' لکھی:

تم بالکل ہم جیسے نکلے،
اب تک کہاں چھپے تھے بھائی!
وہ مورکھتا، وہ گھامڑ پن،
جس میں ہم نے صدی گنوائی!
آخر پہنچی دوار تمہارے،
ارے بھدائی بہت بدھائی!

ان کی یہ نظم دونوں ممالک کے ایک جیسے حالات کی ترجمانی کرتی ہے۔

جب فہمیدہ ریاض کی تصویر پر نظر پڑتی نہ جانے کیوں امریتا پریتم کا خیال آجاتا۔ دونوں ہی آزادی انساں اور حقوق نسواں کی علم بردار ہونے کے ساتھ صنف نازک ہونے کا درد

برداشت کر رہی تھیں۔ ایک ہندوستان میں اپنا راگ الاپ رہی تھی تو دوسری پاکستان میں محو ترنم تھی، لیکن دونوں کا راگ ایک تھا۔ 6 سال گزار کر جب دلی سے روانہ ہوئیں تو دلی سے متعلق ایک جذباتی نظم لکھی جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دلی تری چھاؤں بڑی قہری ،
مری پوری کایا پگھل رہی
مجھے گلے لگا کر گلی گلی،
دھیرے سے کہے 'تو کون ہے ری؟'
میں کون ہوں ماں تری جائی ہوں،
پر بھیس نئے سے آئی ہوں
میں رمتی پہنچی اپنوں تک،
پر پریت پرائی لائی ہوں
تاریخ کی گھور گپھاؤں میں،
شاید پائے پہچان مری
تھا بیچ میں دیس کا پیار گھلا،
پردیس میں کیا کیا بیل چڑھی
نس نس میں لہو تو تیرا ہے،
پر آنسو میرے اپنے ہیں
ہونٹوں پر رہی تری بولی،
پر نین میں سندھ کے سپنے ہیں۔

واپسی کے بعد پاکستانی حکومت کے خلاف عوامی احتجاج میں شامل فہمیدہ ریاض عوام کی ہمت تھیں۔ مشرقی پاکستان بننے کے بعد بیدار مغز افراد عوام کے بکھرتے خواب کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا امن وسکون غارت ہوتا نظر آرہا تھا۔ حبیب جالب، فہمیدہ ریاض، شہر یار، فیض احمد فیض، کشور ناہید جیسے دانشوروں کی ایک لمبی فہرست بھی تھی جنہیں رات کا فاصلہ طویل ہوتا نظر آرہا تھا۔ جالب اور فہمیدہ کو اکثر و بیشتر ان حالات پر محول گفتگو دیکھا جاتا۔ ملک کی تقسیم کا درد

پھر تقسیم در تقسیم کا درد اور انسانیت کا خون ہونا ان شعرا و شاعرات کو انقلابی بنا گیا۔ ان کا عالم یہ تھا کہ ہر وقت ان کا دل دوسروں کے لیے دھڑکتا تھا۔ فہمیدہ ریاض لوگوں کی محبوب شاعرہ تھیں۔ حبیب جالب نے تو فہمیدہ ریاض کو اپنی ہم عصر شاعرات میں ممتاز قرار دیا۔ وہ فہمیدہ ریاض کی فکر و نظر کے قائل تھے۔ ریاض بھی جالب صاحب کی محبت و عقیدت کی قدرداں تھیں۔ انھوں نے جالب صاحب کی زندگی میں ہی ان کے لیے نظمیں لکھ کر اس کا اظہار کیا اور جالب کے اعزاز میں ہونے والے جلسوں میں یہ نظمیں بارہا پڑھیں، جن کے چند اشعار پیش ہیں:

تاریخ کبھی ہم سے جو مانگی کی حساب
ہم پیش کریں گے ترے نغموں کی کتاب
کیا بخت سیہ اپنا وطن لایا تھا
کس طور گزار ے ہیں مسلسل یہ عذاب
تاریخ نے خلقت کو تو قاتل ہی دیے
خلقت نے دیا ہے اسے جالب سا جواب

انھیں اپنے ہم عصر شعرا و شاعرات کے علاوہ عالمی سطح پر جہاں کہیں بھی اپنی فکر و نظر اور اصول کے لوگ نظر آئے، انھوں نے اردو دنیا کے لوگوں کو بھی ان سے روبرو کرانے کی پوری کوشش کی۔ اس کے لیے انھوں نے ان زبانوں کی کتابوں کے تراجم کیے، ان کا مطالعہ کافی وسیع تھا، اسپین کی ولادہ مستکفی سے لے کر ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد اور البانیائی، سندھی، انگریزی زبانوں کے رائٹر اور صوفی سنت شعرا کے کلام کا بغور مطالعہ کیا۔ وہ ایک کامیاب مترجم تھیں۔ فرید الدین عطار، شاہ عبدالبٹھائی، شیخ سعدی، مولانا جلال الدین رومی، فروغ زاد کے کلام کے تراجم کے علاوہ فوزیہ سعید کی انگریزی کتاب 'ہیرا منڈی' کا ترجمہ کیا۔

ریاض صاحب ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد کے کلام میں اپنے کلام کی بازگشت محسوس کرتی تھیں فروغ فرخ زاد کی نظموں کا ترجمہ 'کھلے دریچے' میں فہمیدہ صاحبہ رقم طراز ہیں:

''نسائیت فروغ کی شاعری کا اصل جوہر ہے، اس بے مثال شاعرہ نے جرأت اور بے باکی سے نسوانی احساسات کو قلم بند کیا۔ فروغ کے کلام کے بے شمار محاسن ہیں۔ ان کی ہر نظم میں ایک انوکھی خوبی اور

جدت ہے۔ ان کے لیے شاعری کوئی شغل نہیں، بلکہ روح وقلب کی حقیقت اور گہرے مشاہدے کا نام ہے۔

''فروغ فرخ زاد کی نظموں کا ترجمہ میرے لیے ایک مسرت انگیز تخلیقی تجربہ تھا۔ ترجمہ میں اصل نظموں کی روح اور نغمگی جوں کی توں موجود ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ سرتا سر فروغ فرخ زاد ہی ہے جو اپنی نظموں کے اصل شعری جوہر کے ساتھ میرے طرح دوسرے قارئین کو مسحور خیرہ کر دے گی''۔

فہمیدہ ریاض کی نظموں میں نسائیت کا گہرا رنگ ہے۔ عورتوں کے استحصال مرد عورتوں کے آپسی تعلقات، پرانے رسم و رواج سے انحراف ان کی شاعری کے اہم ایشوز ہیں۔ فہمیدہ ریاض اپنی شاعری کی شکل میں ایک زندہ رہنے والی شاعرہ ہیں۔ ہر بڑے شاعر کی طرح اپنے عہد کے ساتھ ہی آنے والے زمانوں کی بھی شاعرہ ہیں کیوں کہ جو باتیں انھوں نے کہی ہیں، وہ آنے والے زمانے کے لیے بھی ہیں۔ فکر کی بلند پروازی اور دور اندیشی زندہ و جاوید ہونے کا خاصہ ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آنے والا زمانہ فہمیدہ ریاض کی فکر ونظر کا زمانہ ہوگا۔ وہ ہر لمحہ متحرک رہنے والی شخصیت تھیں۔ ایسے ہی لوگ تاریخ اور لوگوں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں، مرحومہ میں یہ خاصیت بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔

(امنگ، روزنامہ راشٹریہ سہارا، 9دسمبر 2018)

☆☆☆

ادارہ

غبار خاطر کا مقدمہ از پروفیسر محمد اجمل خاں

(جسے مولانا آزاد تکلفاً اپنا نہیں کہتے)

غبار خاطر مولانا آزاد کے احمد نگر جیل کے اندر صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خان شرانی کے نام لکھے گئے خطوط (جو جون 1945 کے بعد غالبًا اسی سال کتابی شکل میں شائع ہوگئے)، اس کا **ابتدائیہ** جسے ہم نے مقدمہ کا نام دیا ہے، اس مقدمہ کے ساتھ پھر دوبارہ یہ کتاب 1947 میں ایک بہتر سج دھج کے ساتھ لاہور سے شائع ہوئی؛ مزید بہتر دھج کے ساتھ یہ ساہتیہ اکادمی سے شائع ہوئی، ذاکر صاحب اور مالک رام صاحب کے مشترک عندیہ سے مولانا آزاد کی تصانیف کے لئے گویا ایک چیئر ساہتیہ اکادمی میں قائم ہوئی جس کے تحت مولانا آزاد کی کتابیں بڑے اہتمام سے شائع ہوئیں۔ انھیں کتابوں میں غبار خاطر بھی تھی جسے مالک رام صاحب نے بڑے سلیقے سے مرتب کر کے مناسب حواشی کے ساتھ شائع کیا، اس مالک رام ایڈیشن کے بعد 'مولانا ابوالکلام کے ادب دوستوں' نے یہ خیال ظاہر کیا کہ غبار خاطر کا پرانا مقدمہ جس پر بطور مقدمۂ نگار اجمل خاں کا نام ہے، اور جس کی جگہ مالک رام صاحب نے اپنا مقدمہ لکھا ہے، بہتر ہوتا کہ اجمل خاں کے نام والا پہلا مقدمہ تو رہتا ہی، مالک رام صاحب کی تحریر مقدمۂ ثانی کے طور سے شامل ہوجاتی۔

غبار خاطر کی ساہتیہ اکادمی ایڈیشن کی اشاعت پر یہ سوال اٹھانے والوں

نے زیرِ لب کچھ اس شبہ کا بھی اظہار کیا کہ یہ اجمل خاں سے منسوب غبارِ خاطر کے پہلے ایڈیشن کا مقدمہ اس لئے بھی ڈراپ کیا جانا مناسب نہ ہوگا کہ قوی امکان ہے کہ یہ تحریر خود مولانا آزاد کی لکھی یا لکھوائی ہوئی ہو۔ اور اس لحاظ سے یہ واقعۃً زیادہ قیمتی تحریر ہوجاتی ہے ۔اور اب تو اس لئے بھی بہت قیمتی ہوگئی ہے کہ ساہتیہ اکیڈمی کے ایڈیشن کے بعد پرانا مقدمہ تو **بازار میں تقریباً** ناپید ہوگیا ہے، پرانی لائبریریوں میں بھلے ہی مل جائے۔

تو اب غبارِ خاطر کے پہلے ایڈیشن کے مقدمہ کا مسئلہ چھڑتا ہے جو بظاہر پروفیسر اجمل خاں (مولانا آزاد کے پرائیویٹ سکریٹری) کے نام سے ہے۔

تین صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو یہ تمام و کمال پروفیسر اجمل خاں کا لکھا ہوا ہے؛ یا تمام و کمال مولانا آزاد کا املا ہے؛ اور یا پھر اجمل خاں نے لکھا ہے اور مولانا نے اس کو ترمیم و اضافہ کے بعد کتاب میں شامل کرایا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ الہلال (اورا لبلاغ) کے پہلے دور میں، جب سید سلیمان، مولانا کے اسسٹنٹ کے طور سے اخبار کے ادارے میں شریک تھے تو ان کی بہت سے تحریریں مولانا آزاد کی تحریریں سمجھی جاتی تھیں، جنھیں بعد میں سید سلیمان ندوی نے دعویٰ کیا کہ فلاں فلاں تحریریں مولانا آزاد کی نہیں بلکہ ان کی لکھی ہوئی ہیں؛ یہ بھی صحیح ہے کہ **تذکرہ** کا مقدمہ جس پر مقدمہ نگار کی حیثیت سے فضل الدین احمد کا نام ہے(جو مولانا کے خسر تھے) اس پر بھی اس وقت، اور بعد میں بھی لوگوں نے یہ شبہ ظاہر کیا تھا کہ یہ خود مولانا آزاد کا لکھا ہوا ہے (یا ان کا املا کرایا ہوا ہے) ۔

اب یہ غبارِ خاطر کے مقدمہ کی بات چھڑی ۔الہلال کی تحریروں (مشہد اکبر وغیرہ) کے بارے میں سید سلیمان ندوی نے جو دعوے کیے کہ یہ ان کی تحریریں ہیں، مولانا نے ان کے دعووں کو بظاہر تسلیم کر لیا یہ کہہ کر کے اور بھی جو کچھ تحریریں اپنی طرف منسوب کرنا چاہیں، خوش آمدید۔ فضل الدین احمد کے نام سے جو تحریر بطور مقدمہ

تذکرہ چھپی اس کے بارے میں لوگوں کو اس لئے شبہ رہا کہ فضل الدین صاحب کے اس مقدمہ کے علاوہ کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ لکھنے پڑھنے والے آدمی تھے، اس لئے اس پر لوگوں کا شبہ گیا کہ مولانا نے ان کا نام بعض نکات سے اپنی بچت کے لئے دے دیا ہے۔ لیکن اجمل خاں تو مشہور ومعروف مصنف تھے، قرآنیات پر ان کی کتابیں اور گیتا پر نغمۂ خداوندی کے نام سے ان کا مبسوط مطالعہ سے سب واقف ہیں۔ تو پھر یہ غبار خاطر پر ان کے نام سے مقدمہ کیا نوعیت رکھے گا۔

ہمارا خیال ہے کہ تذکرہ پر مولانا آزاد نے فضل الدین احمد کا نام دے کر، اور اس طرح اپنی بچت کر کے جو پہل کی تھی، امکان ہے کہ اجمل خاں کا نام دے کر غبارِ خاطر کے مقدمہ کی تصنیف کو اپنا قرار نہ دے کر شاید اس لئے بچت کا پہلو نکالا ہو کہ اب تو وہ قوم کے، اور پوری دنیا کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے بھی اکابر میں شمار ہوتے تھے۔ تو محض اس احتیاط کے پیش نظر کہ اس کتاب (غبارِ خاطر) میں کوئی ایسی ویسی بات نہ در آئی ہو جو ان کی شہرت اور رتبہ کے منافی ہو، سو شہرت تو اب عالمگیر تھی اور رتبہ کی عظمت کا یہ عالم تھا کہ کانڈین نیشنل نگریس کے اتنی طویل مدت سے صدر تھے (گویا راشٹر پتی) جتنی مدت تک کانگریس کی تاریخ میں کوئی بھی اس کا سربراہ نہیں رہا۔ تو قدرتی طور سے احتیاط اور بچت پیش نظر اگر یہ مقدمہ انھوں نے املا کرادیا ہو یا خود لکھ دیا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

اب کچھ آگے کی بات یہ آتی ہے، یعنی: کچھ اندرونی شہادت،

غبار خاطر کے پہلے ایڈیشن کا ابتدائیہ جسے مقدمہ کہہ سکتے ہیں، اصلاً کوئی سرخی نہیں ہے۔ یہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا، لیکن اندر لکھا ہے ''آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مولوی محمد احمد خاں پرنٹر پبلشر شائع ہوا''۔ سال اشاعت کہیں نہیں دیا ہوا ہے، غلط نامہ شروع میں تین صفحہ میں ہے جس کا عنوان ہے ''مطالعہ سے پہلے''۔

سب سے پرانے غبار خاطر کا پہلا ٹائٹل، نقل مطابق اصل، اس طرح ھے :

●

مپرس تا چہ نوشتہ ست کلکِ قاصرِ ما
خطِ غبارِ من ست ایں غبارِ خاطرِ ما

غبارِ خاطر

یعنی

مولانا ابو الکلام آزاد کے بعض مکاتیب جو انہوں
نے قلعۂ احمد نگر کی قید کے زمانے میں بعض
احباب کے نام لکھے تھے۔ ور جو مکتوب الیہ کو ان
کی رہائی کے بعد ملے۔ مولانا 9اگست 1942 کو
بمبئی میں گرفتار کر کے احمد نگر پہنچائے گئے، اور
15جون 1945 کو رہا ہوئے۔

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

کتاب کے اندر پھر ٹائٹل آتا ھے، جس میں کتاب کے نام اور پبلشر کے نام کے بیچ میں یہ سطریں آتی ھیں:

''قلعۂ احمد نگر کی اسیری (از 9اگست 1943ء تا
15جون 1945ء) کے زمانے کی بعض تحریرات''
از ابو الکلام آزاد

●

اور اب مقدمہ:

اس قدیم ترین متن کے مقدمہ کے ملاحظہ کے بعد ہم مزید کچھ کہنا چاہیں گے مگر اب سب سے پہلے وہ متنازعہ فیہ مقدمہ عکسی شکل میں ملاحظہ ہو، اور اس قدیمی شان سے ملاحظہ ہو جیسا کہ وہ پہلی بار چھپا تھا: (ش)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم:

تاریخِ واقعاتِ شہاں نانوشتہ اند
افسانۂ کہ گفت نظیری کتاب شد!

❖

اِس مجموعے میں جس قدر مکتوبات ہیں، وہ تمام تر نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی رئیس بھیکم پور ضلع علی گڈھ کے نام لکھے گئے تھے۔ چونکہ قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں دوستوں سے خط و کتابت کی اجازت نہ تھی، اور حضرت مولانا کی کوئی تحریر باہر نہیں جا سکتی تھی، اس لیے یہ مکاتیب وقتاً فوقتاً لکھے گئے اور ایک فائل میں جمع ہوتے رہے۔ ۱۵۔ جون ۱۹۴۵ء کو جب مولانا رہا ہوئے، تو ان مکاتیب کے مکتوب الیہ تک پہنچنے کی راہ باز ہوئی۔

نواب صاحب سے حضرت مولانا کا دوستانہ علاقہ بہت قدیم ہے۔ مولانا نے خود ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ پہلے پہل اُن سے ملاقات ۱۹۰۶ء میں ہوئی تھی گویا ایک کم چالیس برس اس رشتۂ اخلاص و محبت پر گزر چکے، اور ایک قرن سے بھی زیادہ وقت کا امتداد اس کی تازگی اور شگفتگی کو افسردہ نہ کر سکا۔ دوستی و یگانگت کے ایسے ہی علائق ہیں، جن کی نسبت کہا گیا تھا:

تزول جبال الراسیات وقلبھم
عن المحبّ لایخلوا ولا یتزلزل!

البتہ یہ علاقۂ محبت واخلاص صرف علمی اور ادبی ذوق کے رشتۂ اشتراک میں محدود ہے۔ سیاسی عقائد واعمال سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سیاسی میدان میں مولانا کی دوسری راہ ہے، اور نواب صاحب اس سے رسم و راہ نہیں رکھتے۔

حضرت مولانا کی زندگی مختلف اور متضاد حیثیتوں میں بٹی ہوئی ہے۔ وہ ایک ہی زندگی اور ایک ہی وقت میں مصنف بھی ہیں، مقرر بھی ہیں، مفکر بھی ہیں، فلسفی بھی ہیں، ادیب بھی ہیں، مدبر بھی ہیں، اور ساتھ ہی سیاسی جد وجہد کے میدان کے سپہ سالار بھی ہیں۔ دینی علوم کے تبحر کے ساتھ عقلیات اور فلسفے کا ذوق بہت کم جمع ہوتا ہے، اور علم اور ادب کے ذوق نے ایک ہی دماغ میں بہت کم آشیانہ بنایا ہے۔ پھر علمی اور فکری زندگی کا میدان، عملی سیاست کی جد وجہد سے اتنا دور واقع ہوا ہے کہ ایک ہی قدم دونوں میدانوں میں بہت کم اٹھ سکے ہیں۔ مگر مولانا آزاد کی زندگی ان تمام مختلف اور متضاد حیثیتوں کی جامع ہے۔ گویا ان کی ایک زندگی میں بہت سی زندگیاں جمع ہوگئی ہیں:

وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہیں!

اس صورتِ حال کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے علائق کا دائرہ کسی ایک گوشے ہی میں محدود نہیں ہے۔ علوم دینیہ کے حجروں کے زاویہ نشین، ادب وشعر کی محفلوں

کے بزم طراز علم اور فلسفے کی کاوشوں کے دقیقہ سنج، اور میدانِ سیاست کے مدبّر اور معرکہ آرائیوں کے شہ سوار، سب کے لیے ان کی شخصیت یکساں طور پر کشش رکھتی ہے، اور سب اس مجمع فضل و کمال کے افادات سے بقدرِ طلب و حوصلہ مستفید ہوتے رہتے ہیں:

تو نخلِ خوش ثمر کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش بریدند و در تو پیوستند!

البتہ ان کے ارادت مندوں کا حلقہ جس قدر وسیع اور بین القومی ہے، اُتنا ہی دوستوں کا دائرہ تنگ ہے:

کسے کہ زود گُسل نیست، دیر پیوند ست!

ایسے خوش قسمت اصحاب جنہیں مولانا اپنے "دوستوں" میں تصوّر کرتے ہوں خال خال ہیں، اور صرف وہی ہیں جن سے علم و ذوق کے اشتراک، اور رجحانِ طبیعت کی مناسبت نے انہیں وابستہ کر دیا ہے۔ ایسے ہی خال خال حضرات میں ایک شخصیت نواب صدر یار جنگ کی ہے۔

نواب صاحب مسلمانانِ ہند کے گزشتہ دورِ علم و مجالس کی یادگار ہیں آج سے تیس چالیس برس پیشتر کا زمانہ، مولانا آزاد کی ابتدائی علمی زندگی کا زمانہ تھا۔ وہ اُس وقت کے تمام اکابر و افاضل سے عمر میں بہت چھوٹے تھے یعنی ان کی عمر سترہ اٹھارہ برس سے زیادہ نہ تھی لیکن اپنی غیر معمولی ذہانت، اور محیّر العقول

علمی قابلیت کی وجہ سے سب کی نظروں میں محترم ہو گئے تھے، اور معاصرانہ اور دوستانہ حیثیت سے ملتے تھے۔ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ حکیم محمد اجمل خاں وغیرہم، سب سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے، اور علمی اور ادبی صحبتیں رہا کرتی تھیں۔ اسی عہد کی صحبتوں میں نواب صدر یار جنگ سے بھی ان کی شناسائی ہوئی، اور پھر شناسائی نے عمر بھر کی دوستی کی نوعیت پیدا کر لی۔ مولانا اس رشتے کو خصوصیت کے ساتھ عزیز رکھتے ہیں کیونکہ یہ اُس عہد کی یادگار ہے، جو بہت تیزی کے ساتھ گزر گیا، اور ملک کی مجلسیں قدیم صورتوں اور صحبتوں سے یک قلم خالی ہو گئیں۔

مولانا کی سیاسی زندگی کے طوفانی حوادث اُن کی تمام دوسری حیثیتوں پر چھا گئے ہیں۔ لیکن خود مولانا نے اپنی سیاسی زندگی کو اپنے علمی اور ادبی علائق سے بالکل الگ رکھا ہے۔ جن دوستوں سے ان کا علاقہ محض علم و ادب کے ذوق کا علاقہ ہے، وہ ان کے علائق کو سیاسی زندگی سے ہمیشہ الگ رکھتے ہیں، اور اس طرح الگ رکھتے ہیں، گویا ان کی زندگی میں سیاسی افکار و اعمال کا کوئی گوشہ سرے سے وجود ہی نہیں رکھتا۔ وہ اپنی سیاسی زندگی کی پرچھائیں بھی علمی زندگی پر پڑنے نہیں دینگے۔ وہ جب کبھی ان دوستوں سے ملیں گے، یا خط و کتابت کرینگے، تو اس میں سیاسی افکار و اعمال کا کوئی

ذکر نہ ہوگا۔ ایک بے خبر آدمی اگر اُس وقت کی باتوں کو سُنے، تو خیال کرے کہ اس شخص کو سیاسی دنیا سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہے، اور علم و ادب کے سوا اور کسی ذوق سے آشنا نہیں۔ ایک مرتبہ اس معاملے کا خود مولانا سے ذکر ہوا تو فرمانے لگے۔ جس شخص سے میرا تعلق جس حیثیت سے ہے، میں ہمیشہ اُسے اُسی حیثیت میں محصور اور محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ دوسری حیثیتوں سے اُسے آلودہ کروں۔ چنانچہ نہ تو کبھی وہ ان دوستوں سے اس کی توقع رکھتے ہیں کہ اُن کی سیاسی زندگی کے آلام و مصائب میں شریک ہوں، نہ کبھی اس کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ ان کے سیاسی افکار و اعمال سے اتفاق کریں۔ سیاسی معاملے میں وہ ہر شخص کو خود اُس کی پسند اور خواہش پر چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ اُن سے کسی علمی، مذہبی اور ادبی تعلق سے برسوں ملتے رہیے۔ وہ کبھی بھولے سے بھی سیاسی معاملات کا آپ سے ذکر نہیں کرینگے۔ ایسا معلوم ہوگا، جیسے اس عالم کی اُنہیں کوئی خبر ہی نہیں!

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان کی زندگی سیاسی میدانوں کے طوفانی حوادث سے گھری ہوتی ہے۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ایک دن یا ایک گھنٹے کے بعد کیا حوادث پیش آئینگے۔ ممکن ہے کہ قید و بند کا مرحلہ پیش آجائے۔ بہت ممکن ہے کہ جلاوطنی، یا اس سے بھی زیادہ کوئی خطرناک صورتِ حال ہو۔ لیکن اچانک، عین اسی عالم میں کسی ہم ذوق دوست کی یاد اُن

کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے، اور وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے سارے گرد وپیش سے یک قلم کنارہ کش ہوکر اس کی جانب ہمہ تن متوجہ ہوجاتے ہیں اور اس استغراق اور انہماک کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں، گویا اُن کی زندگی پر کسی خطرناک حادثے کا سایہ بھی نہیں پڑا ہے، اور پوری جمعیتِ خاطر کے ساتھ اپنے ذوق وکیف میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وہ اُس وقت اپنی یکساں اور بے کیف سیاسی مشغولیت کا مزہ بدلنے کے لیے کوئی ایسا موضوع چھیڑ دینگے، جو سیاسی زندگی کے میدانوں سے ہزاروں کوس دور ہوگا۔ علم وفن کا کوئی مبحث، فلسفیانہ غور وفکر کی کوئی کاوش، طبعیات کا کوئی نیا نظریہ، تصوف واشراق کا کوئی وارده، یا پھر ادب وانشا کی سخن طرازی اور شعر وسخن کی بزم آرائی، غرض کہ سیاست کے سوا ہر ذوق کی وہاں گنجائش ہوگی، ہر وادی کی وہاں پیمائش کی جاسکیگی۔ اُس وقت کوئی اُنہیں دیکھے تو صاف دکھائی دے کہ زبانِ حال سے خواجہ حافظ کا یہ شعر دُہرا رہے ہیں:

کمند صید بہرامی بیفگن، جامِ مے بردار
کہ من پیمودم ایں صحرا، نہ بہرام ست نے گورش!

مولانا اس صورتِ حال کو "تحمیض" سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ "تحمیض" عربی میں منہ کا مزہ بدلنے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ "حمّضوا مجالسکم" یعنی اپنی مجلسوں کا مزہ بدلتے رہو۔ وہ کہتے ہیں، اگر گاہ گاہ میں اس تحمیض کا موقع نہ نکالتا رہوں

تو میرا دماغ بے کیف اور خشک مشغولیتوں کے بار مسلسل سے تھک کر معطل ہو جائے۔ اس طرح کی تحمیض میرے لیے ذہنی عیش و نشاط کا سامان بہم کر دیا کرتی ہے، اور دماغ از سرِ نو تازہ دم ہو جاتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عین سیاسی طوفانوں کے موسم میں کوئی ہم ذوق دوست آنکلتا ہے اور انہیں موقع مل جاتا ہے کہ قلم و تخیل کی جگہ صحبت و مجالست کے ذریعہ اپنی مشغولیت کا ذائقہ بدلیں۔ وہ معاً اپنے گرد و پیش کی دنیا سے باہر نکل آئینگے، اور ایک انقلابی تحوّل کے ساتھ اپنے آپ کو ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دینگے۔ وہ فوراً اپنے خادمِ خاص عبداللہ کو پکارینگے کہ چائے لاؤ۔ یہ گویا اس کا اعلان ہوگا کہ ان کا خاص وقت آگیا۔ پھر شعر و سخن کی صحبت شروع ہو جائیگی، علم و ادب کا مذاکرہ ہونے لگیگا، اور اعلیٰ درجہ کی چینی چائے "وھائٹ جسامن" کے چھوٹے چھوٹے فنجانوں کا دور چلنے لگیگا کہ

حاصلِ کارگہِ کون و مکاں ایں ہمہ نیست
بادہ پیش آر کہ اسبابِ جہاں ایں ہمہ نیست!

انہیں اپنی طبیعت کے انفعالات پر غالب آنے، اور اپنے آپ کو اچانک بدل لینے کی جو غیر معمولی قدرت حاصل ہو گئی ہے، وہ فی الحقیقت ایک حیرت انگیز بات ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں

خود اپنی آنکھوں سے اس انقلابی تحوّل کو دیکھنے کا موقع ملا ہو مجھے آٹھ برس سے یہ موقع حاصل ہے۔

نواب صدر یار جنگ ایک خاندانی رئیس ہیں۔ ملک کے سیاسی معاملات میں اُن کا طرزِ عمل وہی رہتا آیا ہے جو عموماً ملک کے طبقہ رؤسا کا ہے یعنی سیاسی کشمکش کے میدانوں سے علیحدگی اور اپنے گوشۂ سکون و جمعیت پر قناعت۔ برخلاف اس کے مولانا کی پوری زندگی سیاسی جد و جہد کی جنگ آزمائی اور معرکہ آرائی کی زندگی ہے۔ لیکن صورتِ حال کا یہ اختلاف بلکہ تضاد، ایک لمحے کے لیے بھی ان کے باہمی علائق کی یگانگت و یک جہتی پر اثر نہیں ڈال سکتا۔ نہ کبھی مولانا سیاسی معاملات کی طرف کوئی اشارہ کرینگے، نہ کبھی نواب صاحب کی جانب سے کوئی ایسا تذکرہ درمیان آئے گا۔ دونوں کا علاقہ ذاتی محبت و اخلاص اور ذوقِ علم و ادب کے اشتراک کا علاقہ ہے۔ اور ہمیشہ اسی دائرے میں محدود رہتا ہے۔ چنانچہ قلعہ احمد نگر کے ایک مکتوب مؤرخہ ۲۹۔ اگست ۴۲ء میں وہ سیاسی حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "مجھے یہ قصہ یہاں نہیں چھیڑنا چاہیے۔ میری آپ کی مجلس آرائی اِن معاملات کے لیے نہیں ہوا کرتی:

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

میری دُکانِ سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہتی، لیکن آپ کے لیے کچھ

نکالتا ہوں تو احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے"۔

۱۵۔ جون ۴۵ء کو مولانا تین برس کی قید و بند کے بعد رہا ہوئے لیکن رہائی کے بعد ہی انہیں فوراً شملہ پہنچنا، اور شملہ کانفرنس کی مشغولیتوں میں گم ہو جانا پڑا۔ اب وہ قلعۂ احمد نگر اور نکوڑا کے قید خانے کی جگہ وائسرائے لاج شملہ کے مہمان تھے۔ لیکن یہاں بھی صبح چار بجے کی سحر خیزی اور خود مشغولی کی معمولات برابر جاری رہیں۔ ایک دن صبح اچانک نواب صاحب کی یاد سامنے آجاتی ہے، اور وہ ایک شعر لکھ کر تین برس پیشتر کی خط و کتابت کا سلسلہ از سر نو تازہ کر دیتے ہیں۔ پھر تبدیل آب و ہوا کے لیے کشمیر جاتے ہیں اور ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم ہو جاتے ہیں۔ یہ ہاؤس بوٹ نسیم باغ کے کنارے لگا دیا گیا تھا، اور مولانا کی صبحیں اسی کے ڈرائنگ روم میں بسر ہونے لگی تھیں یہاں پھر خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوتا ہے اور ۳۔ ستمبر ۴۵ء کو مولانا اپنے ایک مکتوب میں قلعۂ احمد نگر کے حالات کی حکایت چھیڑ دیتے ہیں، اور ان مکاتیب کی نگارش کے اسباب و محرکات کی تفصیلات لکھتے ہیں جو اس مجموعے میں جمع کیے گئے ہیں۔ چونکہ رہائی کے بعد کے مکاتیب کا یہ حصہ بھی ان مکاتیب سے مربوط ہو گیا ہے، اس لیے مولانا سے اجازت لے کر میں نے انہیں بھی اس مجموعے کی ابتدا میں شامل کر دیا ہے۔ رہائی کے بعد کے یہ مکاتیب اس مجموعے کے لیے

دیباچے کا کام دینگے۔

مولانا کو سیکڑوں خطوط لکھنے اور لکھوانے پڑتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کی نقول نہیں رکھی جاسکتیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اُنھوں نے اپنے خاص علمی اور ادبی مکاتیب کی نقول رکھنے کی بھی کبھی کوشش نہیں کی اور اس طرح سیکڑوں مکاتیب ضائع گئے۔

۴۰ء میں، میں نے مولانا سے درخواست کی کہ جو خاص مکاتیب وہ دوستانِ خاص کو لکھا کرتے ہیں، اُن کی نقول رکھنے کی مجھے اجازت ملے۔ چنانچہ مولانا نے اجازت دے دی، اور اب ایسا ہونے لگا کہ جب کبھی مولانا کوئی مکتوب خاص اپنے ذوق و کیف میں لکھتے، میں پہلے اُس کی نقل کرلیتا، پھر ڈاک میں ڈالتا۔ نواب صاحب کے نام ۴۰ء اور ۴۲ء میں جس قدر خطوط لکھے گئے، سب کی نقول میں نے رکھ لی تھیں اور میرے پاس موجود ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر رہائی کے بعد مولانا نے قلعۂ احمد نگر کے مکاتیب میرے حوالے کیے کہ حسب معمول ان کی نقول رکھ لوں، اور اصل نواب صاحب کی خدمت میں بہ یک دفعہ بھیج دوں۔ لیکن میں نے جب ان کا مطالعہ کیا تو خیال ہوا، کہ ان تحریرات کا محض رنج کے خطوط کی شکل میں رہنا اور شائع نہ ہونا، اردو ادب کی بہت بڑی محرومی اور اربابِ ذوق کی ناقابلِ تلافی حرمانی ہوگی۔ مولانا اُس وقت شملہ میں تھے۔ میں نے بہ اصرار اُن سے درخواست کی کہ ان مکاتیب کو ایک مجموعے

کی شکل میں شائع کرنے کی اجازت دے دیں۔ مجھے یقین ہے کہ مُلک کے تمام اربابِ ذوق و نظر اس واقعے کے شکر گزار ہونگے کہ مولانا نے اشاعت کی اجازت دے دی، اور اس طرح میں اس قابل ہوگیا کہ یہ مجموعہ دیدہ ورانِ علم و ادب کی ضیافت ذوق کے لیے پیش کردوں۔

۱۹۴۲ء میں گرفتاری سے پہلے مولانا لاہور گئے تھے۔ وہاں انفلوئنزا کی شکایت لاحق ہوگئی تھی۔ اُسی حالت میں کلکتے آئے اور صرف تین دن ٹھہر کر ۲۔ اگست کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی صدارت کرنے کے لیے بمبئی روانہ ہوگئے۔ بمبئی جاتے ہوئے ریل میں اُنھوں نے ایک مکتوب نواب صاحب کے نام لکھ کر رکھ لیا تھا کہ بمبئی پہنچ کر مجھے دے دینگے، میں حسب معمول اُس کی نقل رکھ کر اصل ڈاک میں ڈال دونگا۔ لیکن بمبئی پہنچنے کے بعد وہ اپنی مصروفیتوں میں غرق ہوگئے اور مکتوبِ سفر اُن کے اٹاچی کیس میں پڑا رہ گیا۔ یہاں تک کہ ۹۔ اگست کی صبح کو وہ گرفتار ہوگئے۔ چونکہ قلعہ احمد نگر کے پہلے مکتوب میں اُس خط کا ذکر آیا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اُسے بھی ابتدا میں شامل کردیا جائے۔ چنانچہ وہ شامل کردیا گیا ہے۔

میں نے ارادہ کیا تھا کہ مولانا کے اسلوب نگارش (سٹائل) کی نسبت اپنے تاثرات کے اظہار کی جرأت کرونگا، لیکن جب اس ارادے کو عمل میں لانے کے لیے تیار ہوا، تو معلوم ہوا کہ خاموشی کے سوا چارۂ کار نہیں۔ کیونکہ جتنا کچھ اور

جیسا کچھ لکھنا چاہیے، اس کی یہاں گنجائش نہیں، اور جس قدر لکھنے کی گنجائش ہے، وہ اظہارِ تاثرات کے لیے کافی نہیں۔ صرف اتنا اشارہ کر دینا چاہتا ہوں کہ فرانسیسی ادبیات میں ادب کی جس نوعیت کو "ادب اعلیٰ" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر اردو ادب میں اس کی کوئی مثال ہمیں مل سکتی ہے، تو وہ صرف مولانا کی ادبیات ہیں۔

مولانا نے اپنے اسلوبِ نگارش کے مختلف ڈھنگ رکھے ہیں، کیونکہ ہر موضوع ایک خاص طرح کا اسلوب چاہتا ہے۔ اور اُسی اُسلوب میں اُس کا رنگ اُبھر سکتا ہے۔ دینی مباحث کے لیے جو اسلوبِ تحریر موزوں ہوگا، تاریخ کے لیے موزوں نہ ہوگا۔ تاریخی مباحث جس طرز کتابت کے متقاضی ہوتے ہیں، ضروری نہیں کہ ادبی نگارشات کے لیے بھی وہ موزوں ہو۔ عام حالت یہ ہے، کہ ہر شخص ایک خاص طرح کا اسلوب تحریر اختیار کر لیتا ہے، اور پھر جو لکھتا ہے، اُسی رنگ میں لکھتا ہے۔ لیکن مولانا کی خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے علم و ذوق کے تنوّع کی طرح اپنا اسلوب تحریر بھی مختلف قسموں کا رکھا ہے۔ عام دینی اور علمی مطالب کو وہ ایک خاص طرح کے اسلوب میں لکھتے ہیں۔ صحافت نگاری کے لیے اُنھوں نے ایک دوسرا اسلوب اختیار کیا ہے، اور خالص ادبی انشا پردازی کے لیے ان دونوں سے الگ طریقِ نگارش ہے۔

جس زمانے میں "الہلال" نکلا کرتا تھا، تو اُس میں کبھی کبھی وہ خالص ادبی قسم کی چیزیں بھی لکھا کرتے تھے۔ ان تحریروں میں اُنہوں نے ایک ایسا مجتہدانہ اسلوب اختیار کیا تھا جس کی کوئی دوسری مثال لوگوں کے سامنے موجود نہ تھی۔ اس اسلوب کے لیے اگر کوئی تعبیر اختیار کی جا سکتی ہے۔ تو وہ صرف "شعر منثور" کی ہے۔ یعنی وہ نثر میں شاعری کیا کرتے تھے۔ ان کی تحریر از سرتا پا شعر ہوتی تھی۔ صرف ایک چیز اس میں نہیں ہوتی تھی، یعنی وزن۔ اور اس لیے اسے نظم کی جگہ نثر کہنا پڑتا تھا۔

اس طرزِ تحریر کا ایک خاص طریقہ یہ تھا، کہ وہ اپنی نثر کی شاعری کو شعرا کی نظم کی شاعری سے مخلوط و مربوط کر کے ترتیب دیتے تھے۔ اور یہ اختلاط اور ارتباط اس طرح وجود میں آتا تھا کہ اشعار صرف مطالب کی مناسبت ہی سے نہیں آتے، بلکہ بجائے خود مطالب کا ایک جُزء بن جاتے تھے۔ ایسا جزء، کہ اگر اُسے الگ کر دیجیے تو خود نفس مطلب کا ایک ضروری اور لاینفک جزء الگ ہو جائے۔ اکثر حالتوں میں مطالب کا سلسلہ اس طرح پھیلتا تھا کہ پورا مضمون نثر کے چھوٹے چھوٹے پیراگرافوں سے مرکب ہوتا، اور ہر پیراگراف کسی ایک شعر پر ختم ہوتا۔ یہ شعر، نثر کے مطلب سے ٹھیک اسی طرح جڑا اور بندھا ہوا ہوتا، جس طرح ایک ترکیب بند کا ہر بند ٹیپ کے کسی شعر سے وابستہ ہوتا ہے اور وہ شعر بند کا ایک ضروری جزء بن جاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم اور ہر نوعیت کے سیکڑوں شعر پرا باندھے سامنے کھڑے ہیں۔ جس شعر کی جس جگہ ضرورت ہوئی، فوراً اُسے نکالا اور انگوٹھی کے نگینے کی طرح مضمون میں جڑ دیا!

عام علمی اور دینی مباحث کی تحریرات میں مولانا بہت کم اشعار لایا کرتے ہیں۔ صفحوں کے صفحے لکھ جائینگے اور ایک شعر بھی نہیں آئیگا۔ لیکن اس خاص اسلوبِ تحریر میں وہ اس کثرت کے ساتھ اشعار سے کام لیتے ہیں کہ ہر دوسری تیسری سطر کے بعد ایک شعر ضرور آجاتا ہے، اور مطلب کے حُسن و دل آویزی کا ایک نیا پیکر نمایاں کر دیتا ہے۔

قلعہ احمد نگر کے اکثر مکاتیب اسی طرزِ تحریر میں لکھے گئے ہیں۔ انہوں نے نثر میں شاعری کی ہے، اور جس مطلب کو ادا کیا ہے، اس طرح کیا ہے، کہ جدتِ فکر نقش آرائی کر رہی ہے، اور وسعتِ تخیل رنگ و روغن بھر رہی ہے۔ اجتہادِ فکر اور تجدیدِ اسلوب مولانا کی عام اور ہمہ گیر خصوصیت ہے۔ قلم اور زبان کے ہر گوشے میں، وہ طرزِ عام سے اپنی روش الگ رکھینگے اور الفاظ و تراکیب سے لے کر مطالب اور ادائے مطالب کے طرز تک، ہر بات میں تقلیدِ عام سے گریزاں اور اپنے مجتہدانہ انداز میں بے میل اور بے لچک نظر آئینگے۔ انہوں نے جس وقت سے قلم ہاتھ میں سنبھالا ہے ہمیشہ پیش رو اور صاحبِ اسلوب رہے ہیں۔ کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ کسی دوسرے پیش رو کے نقشِ قدم پر چلیں چنانچہ

لوگ نثر میں اشعار لاتے ہیں، تو عموماً اس طرح لاتے ہیں کہ کسی جزئی مناسبت سے کوئی شعر یاد آگیا اور کسی خاص محل میں درج کر دیا گیا۔ لیکن مولانا اس قسم کی تحریرات میں جو شعر درج کرینگے، اس کی مناسبت محض جزئی مناسبت نہ ہوگی، بلکہ مضمون کا ایک ٹکڑا بن جائیگی، گویا خاص اسی محل کے لیے شاعر نے یہ شعر کہا ہے، اور مطلب کا تقاضا پورا کرنے اور ادھوری بات کو مکمل کر دینے کے لیے اس کے بغیر چارہ نہیں۔ اس طرز تحریر پر وہی شخص قادر ہو سکتا ہے، جو کامل درجے کا شاعرانہ فکر رکھنے کے ساتھ ساتھ، اساتذہ کے بے شمار اشعار بھی اپنے حافظے میں محفوظ رکھتا ہو، اور مطالب کی ہر قسم اور ہر نوعیت کے لیے جس طرح کے اشعار بھی مطلوب ہوں، فوراً حافظہ سے نکال لے سکتا ہو پھر ساتھ ہی اس کا ذوق بھی اس درجہ سلیم اور بے داغ ہو کہ صرف اعلیٰ درجے کے اشعار ہی حافظہ قبول کرے، اور حسن انتخاب کا معیار کسی حال میں بھی درجہ سے نہ گرے۔ اس اعتبار سے مولانا کے حافظے کا جو حال ہے، وہ ہم سب کو معلوم ہے۔ قدرت نے انہیں جو خصائص بخشے ہیں، شاید ان سب میں حافظے کی نعمتِ لازوال سب سے بڑی نعمت ہے۔ عربی، فارسی، اور اُردو کے کتنے اشعار ان کے حافظے میں محفوظ ہونگے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔ غالباً خود اُنہیں بھی معلوم نہیں لیکن جوں ہی وہ قلم اُٹھاتے ہیں اور مطالب کی مُناسبتیں اُبھرنے لگتی ہیں، معاً اُن کے حافظے کے بند کواڑ کھلنے شروع ہو جاتے ہیں، اور پھر ایسا

ان مکاتیب میں بھی ان کا مجتہدانہ انداز ہر جگہ نمایاں ہے۔ بغیر کسی اہتمام اور کاوش کے قلم برداشتہ لکھتے گئے ہیں، لیکن قدرت بیان ہے جو بے ساختگی میں بھی اُبھری چلی آتی ہے، اور کاوشِ فکر ہے جو آمد میں بھی آورد سے زیادہ بنتی اور سنورتی رہتی ہے!

ظرافت ہے تو وہ اپنی بے داغ لطافت رکھتی ہے، واقعہ نگاری ہے تو اس کی نقش آرائی کا جواب نہیں۔ فکر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند ہے۔

اِن مکاتیب پر نظر ڈالتے ہوئے سب سے زیادہ اہم چیز جو سامنے آتی ہے، وہ مولانا کا دماغی پس منظر (بیک گراؤنڈ) ہے۔ اسی پس منظر پر افکار و احساسات کی تمام جلوہ طرازیوں نے اپنی جگہ بنائی ہے۔ ایک شخص ۹ اگست کی صبح کو بستر سے اُٹھا، تو اچانک اُسے معلوم ہوا کہ وہ گرفتار شدہ قیدی ہے، اور کسی لامعلوم مقام پر لے جایا جا رہا ہے۔ پھر ایک ایسی شدید فوجی نگرانی کے اندر، جس کی کوئی پچھلی مثال ہندوستان کی سیاسی جد وجہد کی تاریخ میں موجود نہیں، اسے قلعۂ احمد نگر کی ایک عمارت میں بند کر دیا جاتا ہے اور دنیا سے تمام علائق یک قلم منقطع ہو جاتے ہیں۔ وہ اِس حادثہ کے چوبیس گھنٹے کے بعد دوسری صبح کو اُٹھتا ہے، اور قلم اُٹھا کر خامہ فرسائی شروع کر دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن حالات کی تحریک، خیالات میں جنبش پیدا کرتی رہتی

ہے، اور جو کچھ دماغ میں اُبھرتا ہے، بلا روک ٹوک قلم کے حوالے ہو جاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایسے حوصلہ فرسا حالات میں ان کا دماغی پس منظر کیا تھا، اور وقت کے تمام مخالفانہ حالات کو کس نظر اور کس مقام سے دیکھ رہا تھا؟ یہی دماغی پس منظر ہے جس کی نوعیت سے ہر عظیم شخصیت کی عظمت کا اصلی مقام دنیا کے آگے نمایاں ہوتا ہے۔ یہی کسوٹی ہے جس پر ہر انسانی عظمت کسی جا سکتی ہے، اور یہی معیار ہے، جو ہر انسان کی عظمت و پستی کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

اِن مکاتیب میں مولانا نے خود کوشش کی ہے کہ اپنا دماغی پس منظر دنیا کے آگے رکھ دیں، اور اسی لیے یہ غیر ضروری ہو گیا ہے کہ اس بارے میں بحث و نظر سے کام لیا جائے۔ میں صرف معاملے کے اس پہلو پر اہل نظر کو توجہ دلانا چاہتا ہوں خود کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

گزشتہ جولائی میں جونہی ان مکاتیب کی اشاعت کا اعلان ہوا، ملک کے ہر گوشے سے تقاضے ہونے لگے کہ ان کے ترجمے کا بھی سر و سامان ہونا چاہیے۔ کلکتہ، بمبئی، دہلی، الہ آباد، کانپور اور پٹنہ کے پبلشروں کا تقاضا تھا کہ انگریزی، ہندی، گجراتی، بنگالی، تامل وغیرہ زبانوں میں ان کے ترجمے کی اجازت دے دی جائے۔ میں نے یہ تمام درخواستیں مولانا کی خدمت میں پیش کر دیں لیکن انہوں نے ترجمے کی اجازت نہیں دی۔ اُنھوں نے فرمایا کہ چند مکاتیب کے سوا یہ تمام مکاتیب ایک ایسے اسلوب میں لکھے گئے ہیں کہ ان کا کسی

دوسری زبان میں صحتِ ذوق و معیار کے ساتھ ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کیا جائیگا تو اصل کی ساری خصوصیات مٹ جائینگی۔ چنانچہ اس وقت تک ترجمے کی اجازت کسی فرم کو نہیں دی گئی ہے۔ مولانا نے جس خیال سے ترجمے کو روکا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس سے ہر صاحبِ نظر اتفاق کریگا۔ یہ نثر میں شاعری ہے، اور شاعری ترجمے کی چیز نہیں ہوتی۔ البتہ دو چار مکتوب جو بعض فلسفیانہ اور تاریخی مباحث پر لکھے گئے ہیں، ترجمہ کیے جا سکتے ہیں۔ انہیں مستثنیٰ کر دینا چاہیے۔

یہ تمام مکاتیب "صدیق مکرّم" کے خطاب سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ "صدیق" تشدید کے ساتھ "صدّیق" نہیں ہے، جیسا کہ بعض اشخاص پڑھنا چاہینگے، بلکہ بغیر تشدید کے ہے۔ "صداقہ" عربی میں دوستی کو کہتے ہیں "صَدِیق" یعنی دوست۔

۱۱۔ اپریل ۴۳ء کے مکتوب کے آخر میں متمّم بن نویرہ کے مرثیے کے اشعار نقل کیے گئے ہیں (ص ۲۸۳) یہ مرثیہ اُس نے اپنے بھائی مالک کی یاد میں لکھا تھا:

"لقد لامنی عند القبور علی البُکا — رفیقی لتذراف الدموع السوافك
فقال أتبکی کل قبر رأیته — لقبر ثوی بین اللوی فالدکادك
فقلت لہ إن الشجا یبعث الشجا — فدعنی۔ فہذا کلہ قبر مالك!"

ان اشعار کے مطلب کا خلاصہ یہ ہے:

"میرے رفیق نے جب دیکھا کہ قبروں کو دیکھ کر میرے آنسو بہنے لگتے ہیں تو اُس نے مجھے ملامت کی۔ اُس نے کہا یہ کیا بات ہے کہ اُس ایک قبر کی وجہ سے جو ایک خاص مقام پر واقع ہے، تو ہر قبر کو دیکھ کر رونے لگتا ہے؟ میں نے کہا، بات یہ ہے کہ ایک غم کا منظر دوسرے غم کو تازہ کر دیا کرتا ہے، لہٰذا مجھے رونے دے۔ میرے لیے تو یہ تمام قبریں مالک کی قبریں بن گئی ہیں!"

"حکایت بے ستون وکوہ کن" ایران کے قدیم آثار میں ایک اثر "بے ستون" کے نام سے مشہور ہے، اور داستاں سراؤں نے اسے فرہاد کوہ کن کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ مگر دراصل یہ "بے ستون" نہیں ہے، "بہ ستون" (بہستاں یا باغستاں) ہے۔ فارسی قدیم میں "باغ" خدا یا دیوتا کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ مقام "خداؤں کی جگہ" ہے۔

محمد اجمل خاں

افتخار امام صدیقی (مدیر ماہنامہ شاعر)

معاصر اردو ادب کے گونگے خطیب

شاعر کے دفتر میں اردو جہان کے ادبی رسائل اور شعری مجموعے موصول ہوتے ہیں بلا مبالغہ روزانہ دو چار شعری مجموعے تو آ ہی جاتے ہیں۔ تمام شعری مجموعوں میں غزلوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ادبی رسائل کے پھولے ہوئے پیٹ غزلوں کے دباؤ سے اکھڑی ہوئی سانسیں معلوم ہوتے ہیں۔ ہر شعری مجموعے میں جو تعریفی اور توصیفی جھالریں لگی ہوتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی کے میر و غالب ولی دکنی پیدا ہو گئے ہیں۔ ہر جھالر میں لنترانی کرنے والے اپنے ممدوح کو معاصر ادب کا سب سے اہم شاعر قرار دیتے ہیں۔ یہاں ایک تبصرہ یاد آتا ہے جو کسی ادبی رسالے میں خاکسار نے پڑھا تھا۔ مشہور ترقی پسند شاعر ''پچھلے پہر'' کے خالق فلمی نغمہ نگار جاں نثار اختر نے مشہور ترقی پسند شاعر غلام ربانی تاباں کے شعری مجموعے ''حدیث دل'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''عجیب شاعر ہے جو کہ مسلسل ایک ہی شعر کہے جا رہا ہے''۔

موصولہ شعری مجموعوں کے مطالعہ سے لگتا ہے کہ ہر جھالر نگار اپنے ممدوح کو پریم کمار نظر، کرشن کمار طور، منچند اباتی، ندا فضلی اور بشیر بدر سے بڑا شاعر قرار دیتا ہے اور یہ بھی لکھتا ہے کہ ہر غزل میں ایک دو شعر ضرب المثل کے طور پر مشہور ہو سکتے ہیں اور یہ کہ شاعر نے قوافی برتنے میں جدت طرازی سے کام لیا ہے، بحور و ارکان کی تبدیلی سے اپنی غزلوں کو شاعری موسیقی اور نغمگی سے آراستہ کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ خاکسار کو ہر شاعر کے یہاں اس کی اپنی مخصوص بحر میں اشعار پر دئے ہوئے ملتے ہیں، اور دعوی یہ کہ میں نے ''نئی بحروں کا اختراع کیا ہے''۔ مطلب یہ ہوا کہ آج کا ہر شاعر عروضی گیان کا ماسٹر ہے۔ جبکہ عروضی اغلاط پہلی ہی قرأت سے معلوم ہو جاتے ہیں کہ شاعر محترم عروضی گیان تو دور کی بات شاید انہوں نے اردو عربی فارسی کی لغات کے نام بھی نہیں سنے ہوں گے۔ گجرات کے ایک جدید شاعر سامر کھتری اپنے ہر شعری مجموعے میں اپنی ہر غزل کے سرنامے پر تقطیع اور بحر کا نام درج کر دیتے

ہیں۔ یہ اختراعی رنگ کسی شعری مجموعے میں نظر نہیں آتا۔ بقول جاں نثار اختر ''ہر شاعر ایک ہی شعر مسلسل کہے جا رہا ہے''۔ ایسا لگتا ہے کہ شاعر کے پاس ذخیرۂ الفاظ کی کمی ہے۔ وہ محض خانہ پوری کرنے کے لئے اور شعری مجموعوں کی تعداد بڑھانے کے لئے ایک ہی جیسی شاعری کر رہا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ پابند نظمیہ شاعری کے مجموعے نہیں آ رہے ہیں، یہاں تک کہ پہلے کبھی آزد نظمیں، نثری نظمیں یا چٹکی بھر اوزان والی نظموں کے مجموعے دیکھنے کو مل جاتے تھے اب آنکھیں ترس گئی ہیں۔

خاکسار کو ہر شاعر گونگا خطیب معلوم ہوتا ہے یہاں میں اپنا ایک شعر درج کرنا چاہتا ہے۔

وہ جو لفظ تھے وہ تو گم گئے　　جسے دیکھو گونگا خطیب ہے

جو کتابیں تبصرے یا اشتہارات کے لئے موصول ہو رہی ہیں ان میں افسانوں کے مجموعے زیادہ ہیں اور ہر افسانہ نگار اپنے آپ کو کسی طرح، پریم چند، کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس سے کم نہیں سمجھتا۔ جبکہ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ افسانہ نگار کو کہانی کی ابتدا درمیان اور اختتامیہ کا کچھ علم نہیں ہے، جبکہ کہانی ابتدا سے تجسس رنگ ہونی چاہیے اور اپنے قاری کو گرفت میں لینے کا وصف ہونا چاہیے۔ ماضی کے کہانی کاروں میں یہ تمام اوصاف موجود تھے۔ آپ پریم چند کو پڑھنے کے بعد دوبارہ اور سہ بارہ پڑھنا چاہیں گے۔ کرشن چندر کے یہاں شعری زبان اور تخلیقی بیانیہ کیا خوب تھا آج کے افسانہ نگاروں کے یہاں یہ ناپید ہے، ایسا لگتا ہے کہ کہانی مر چکی ہے۔ اور ہر افسانہ نگار گونگا خطیب معلوم ہوتا ہے۔

(جرعات: ماہنامہ شاعر، اگست ۲۰۱۹ء)

☆☆☆

کیفی اعظمی

کیفی صدی تقریب کی مناسبت سے

(ادارہ)

کیفی اعظمی

کیفی

۲۱ جون
جمعہ

محبی سید احتشام صاحب۔ آداب عرض ہے۔ بہت دنوں کے بعد
آپ کا خط آیا تو مجھے طلسم ہوشربا کی جلدیں یاد آئیں جن کی مجھے ایک مدت سے تلاش تھی۔ میں نے
اپنی احباب سے پوچھا کہ شاید اس میں کسی کو مل جائیں۔ ایسی کوئی تحریر نہیں
ملی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ اس لئے میں نے اپنی فرشتی کی کچھ تسلیوں پر
رکھی ہیں۔ آپ نے انشا پردازی کا جس حسن و خوبی سے مظاہرہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ
ہندوستان کے سارے کتب خانوں کا اثاثہ آپ کے سپرد کر دیا جائے تو آپ
انگلستان کے مقابلہ میں جس طرح ہندوستان کے سیکولرازم اور ہندوستانی جمہوریت کی لاج
رکھی ہے اس پر صرف ہمارے ہی نہیں پورے ہندوستانی کو فخر ہونا چاہئے۔ حقیقت
اس خط کا جواب نہیں آتا۔ میں طلسم ہوشربا کو اپنی کتاب کے حصہ نہیں جگہ دوں گا
اس کتاب پر اثر انداز ہوئی لیکن مجھے پڑھنے ایک مجاز تا واقعہ تھے لیکن انہوں نے
بے تحاشا داستانیں منگوا رکھی تھیں انہیں میں داستان امیر حمزہ بھی تھی جو مرحوم کے رشتے
جو لڑکا کرتا تھا وہ اسکو پڑھ کر سنتے اور داستان پڑھنے کے بعد بتاتے لیکن ایک خوبی تھی
مرحوم میں یہ تھی کہ امانت اور ایمانداری کے باوجود دلگیر نہیں رہتے تھے۔ میں داستان سناتا تو وہ میری
ایک پسندیدہ مٹھائی مجھے ضرور کھلاتے تھے۔ امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔ خاکسار

کیفی

KAIFI AZMI P. O. VILLAGE MIJWAN DISTRICT. AZAMGARH U. P. PHONE : 48

عکسِ تحریر

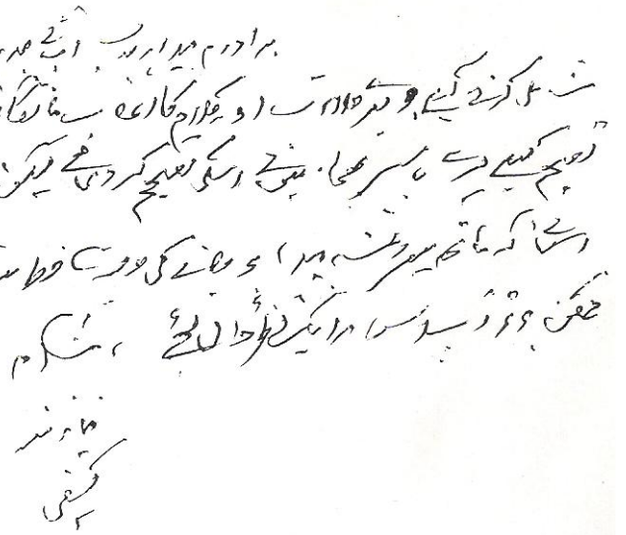

کیفی اعظمی

تاریخ پیدائش: یاد نہیں　　تاریخ وفات: معلوم نہیں

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی　　نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

والد مرحوم کا نام سید فتح حسین رضوی تھا۔ وہ زمیندار تھے لیکن گھر پر کھیتی بھی ہوتی تھی اچھی خاصی خوشحالی تھی لیکن ابا کی دوربین نگاہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اب ہندستان میں زمینداری کا کوئی مستقبل نہیں ہے اس لیے انھوں نے گاؤں سے نکل کر اودھ کی ایک مشہور ریاست بلہرہ میں ملازمت کرلی اور بچوں کو لکھنؤ میں رکھا تاکہ ان کی تعلیم و تربیت ٹھیک سے ہو سکے۔ میں پانچ بھائی ہوں، میرا نمبر چوتھا ہے۔ مجھ سے تینوں بڑے بھائی گیجوٹ میں جب میرے پڑھنے کے دن آئے تو نجانے کیوں ابا مرحوم نے مجھے مولوی بنانا چاہا اور میں شمالی ہند کی مشہور دینی مدرسے سلطان المدارس میں داخل کردیا گیا۔ خیر میں وہاں مولوی تو نہیں بنا مگر اردو، فارسی اور عربی کے کئی امتحانات لکھنؤ اور الہ آباد یونیورسٹیوں سے پاس کئے لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر ماہر، دبیر کامل اور مولوی، الہ آباد یونیورسٹی سے منشی، منشی کامل اور اعلیٰ قابلیت کے امتحانات میں نے اس لئے پاس کئے تھے کہ اس کے بعد انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کروں گا لیکن انھیں دنوں سیاست اور شاعری کا جنون سر پر سوار ہوگیا اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا، شاعری گیارہ برس کی عمر میں شروع ہوگئی کہ اس عمر میں میں نے پہلی غزل لکھی۔

میں نے جس ماحول میں جنم لیا شاعری اس میں رسی بسی ہوئی تھی، شیعہ گھرانے میں جنم لینے کی وجہ سے ایک تو میر انیس کے مرثیے برابر سننے کو ملتے تھے۔ ابا مرحوم باقاعدہ شاعر نہیں تھے کبھی کبھار فارسی میں کچھ کہہ لیا کرتے تھے لیکن ان کے شاعری کا ذوق بہت اعلیٰ تھا اس وجہ سے گھر میں اردو اور فارسی کے تمام اساتذہ کے دواوین اور کلیات تھے۔ مجھے کچی عمر میں فن کے مطالعے کا موقع ملا حالانکہ اس وقت جتنا پڑھتا تھا اس کا بہت کم حصہ سمجھ میں آتا تھا لیکن مطالعے کی عادت ہوگئی جو اب کام آرہی ہے۔ میرے تینوں بڑے بھائی شاعر تھے۔ بڑے بھائی سید ظفر حسین رضوی کا تخلص مجروح تھا۔ منجھلے بھائی سید شبر حسین رضوی کا تخلص وفا تھا، یہ خوش فکر بھی تھے اور خوش گلو بھی۔ بھائی صاحبان چھٹیوں میں جب گھر آتے اور ابا کو اپنا کلام سناتے تو میں بھی بڑے شوق سے وہاں کھڑا ہو جاتا اور غور سے ان کا کلام سنتا لیکن جب کسی بزرگ کی نظر پڑ جاتی تو وہ فوراً ڈانٹ دیا کرتا "تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو، تمہاری سمجھ میں کیا آئے گا، گھر میں جاؤ

اور پان بنوا کر لاؤ۔ مجھے اس بات سے بہت تکلیف پہونچتی لیکن سوائے رو دینے کے اور کرتا کیا، میں روتا ہوا گھر میں جاتا اور باجی سے کہتا یہ لوگ مجھے سمجھتے کیا ہیں، دیکھ لیجئے گا ایک دن میں ان سے بڑا شاعر بن کے دکھاؤں گا۔ باجی مسکراہٹ چھپا کے کہتیں ضرور تم ایک دن بڑے شاعر بنو گے۔ ابھی تو یہ خاصدان اٹھاؤ اور باہر جا کے پان دے آؤ، پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا لیکن ہوا ایسا ہی کہ جب میں نے شاعری شروع کی تو بھائی صاحبان نے شاعری ترک کر دی، شاعری اور سیاست کا شوق ساتھ ساتھ شروع ہوا۔ سیاست میں ہمیشہ میں بائیں بازو کی سیاست کی طرف مائل رہا، میرے خاندان میں اور کسی کو سیاست سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی، مجھے اس بات پر بہت فخر ہے کہ میرے خاندان میں کبھی کوئی فرد فرقہ پرست سیاست سے نہ متاثر ہوا اور نہ اس کا حامی۔

اس وقت کہ میری عمر لگ بھگ ۶۵ برس سے تجاوز کر چکی ابتک میرے پانچ شعری مجموعے شایع ہو چکے ہیں اردو اکادمیوں اور ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ کے علاوہ مجھے لوٹس ایوارڈ بھی مل چکا ہے جو بین الاقوامی اہمیت کا ایوارڈ ہے۔ میری رفیقہ حیات شوکت کیفی اسٹیج کی بہت کامیاب آرٹسٹ ہیں۔ میری بیٹی شبانہ اعظمی فلم کی بہت مشہور اور بہت ہی کامیاب فنکارہ ہیں۔ میرا بیٹا اعمر اعظمی فلم کا بہت بڑا کیمرہ مین ہے۔ بیوی بچے زیادہ تر بمبئی میں رہتے ہیں، میں اپنی بچی کھچی عمر اپنے چھوٹے سے گاؤں جھواں ضلع اعظم گڑھ میں گذارنا اور گاؤں کی کچھ خدمت کرنا چاہتا ہوں، اپنی شاعری سے اب تک نہ مطمئن ہوں نہ مایوس۔ غزلیں کم اور نظمیں زیادہ لکھتا ہوں۔ ایک بڑا پیک لکھنے کا ارادہ ہے شروع بھی کر چکا ہوں اگر زندگی نے جلدی ساتھ نہ چھوڑا تو شاید وہ ایپک مکمل ہو سکے، اس کے بعد موت تو آئیگی لیکن میں مروں گا نہیں۔

انتخاب کلام

اک تم کہ تم کو فکر نشیب و فراز ہے
اک ہم کہ چل پڑے تو بہر حال چل پڑے

مدت کے بعد اس نے جو کی لطف کی نگاہ
جی خوش تو ہو گیا مگر آنسو نکل پڑے

توڑ کے دل کو نہ اس پیار کے انداز سے دیکھ
کہ یہ کم بخت نہ پھر پیار کے قابل ہو جائے

جس پہ ٹھہرا ہو گلستاں کا گلستاں ہونا
ہائے اس پھول کا کھلتے ہی پریشاں ہونا

وہ سب کی سن رہے ہیں سب کو دادِ شوق دیتے ہیں
کہیں ایسے میں میرا قصۂ غم بھی بیاں ہوتا

شل ہو رہے ہیں بازو اک ناؤ کھیتے کھیتے
تنگ آ گیا ہوں یارب میں سانس لیتے لیتے

بس اک جھجک ہے یہی حال دل سنانے میں
کہ تیرا ذکر بھی آئے گا اس فسانے میں

اسی میں عشق کی قسمت بدل بھی سکتی ہے
جو وقت بیت گیا مجھ کو آزمانے میں

یہ کہہ کے ٹوٹ پڑا شاخ گل سے آخری پھول
اب اور دیر ہے کتنی بہار آنے میں

سرخرو وہ رہے، بدنام جفا بھی نہ ہوئی
دل اس انداز سے توڑا کہ صدا بھی نہ ہوئی

اتنا مایوس نہ ہو اپنے خدا سے کوئی
ہاتھ اٹھے رہ گئے اور ہم سے دعا بھی نہ ہوئی

سنا کرو مری جاں ان سے اُن سے افسانے
سب اجنبی ہیں یہاں کس کو کون پہچانے

یہاں سے جلد گذر جاؤ قافلے والو
ہیں میری پیاس کے پھونکے ہوئے یہ ویرانے

بہار آئے تو میرا سلام کہہ دینا
مجھے تو آج طلب کر لیا ہے صحرا نے

جہاں سے پچھلے پہر کوئی تشنہ کام اٹھا
وہیں پہ توڑے ہیں یاروں نے آج پیمانے

تمہیں نے دل کو دل سمجھا نہیں ہے
کوئی ارماں نہ ہو ایسا نہیں ہے

مرے سینے میں اپنا درد بھر دو
اکیلے بوجھ یہ اٹھتا نہیں ہے

مری باہوں سے آگے جا رہی ہو
مگر آگے کوئی دنیا نہیں ہے

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل مرا
کسی کے ہاتھ کا اس پر نشاں نہیں ملتا

کھڑا ہوں کب سے میں چہروں کے ایک جنگل میں
تمہارے چہرے کا کچھ بھی یہاں نہیں ملتا

جو اک خدا نہیں ملتا تو کیا ستم یہ ہے
مجھے خود اپنے قدم کا نشاں نہیں ملتا

کھاتا رہا تھا ٹھوکریں رستے میں ساتھ ساتھ
منزل پہ ڈھونڈھتا ہوں کہ کیا ہو گیا کوئی

سجدے تمام عمر کے بیکار ہو گئے
اس عمر میں جو مجھ سے قضا ہو گیا کوئی

دیوانہ پوچھتا ہے یہ لہروں سے بار بار
کچھ بستیاں یہاں تھیں بتاؤ کدھر گئیں

پایا بھی ان کو کھو بھی دیا چپ بھی ہو رہے
اک مختصر سی رات میں صدیاں گذر گئیں

پیمانہ ٹوٹنے کا کوئی غم نہیں مجھے
غم ہے تو یہ کہ چاندنی راتیں بکھر گئیں

جو وہ مرے نہ رہے میں بھی کب کسی کا رہا
بچھڑ کے ان سے سلیقہ نہ زندگی کا رہا

زمیں نے بوجھ اٹھایا نجانے کس کس کا
رہا جو نقشِ قدم تو کسی کسی کا رہا

یہ حقیقت ہے مالک گماں تو نہیں
میرا چھپر ترا آسماں تو نہیں

آج سرگرم ہیں کچھ لٹیرے بہت
راستے میں کوئی کارواں تو نہیں

رکھ حویلی کی بنیاد یہ دیکھ کر
اس زمیں پر کوئی آسماں تو نہیں

کوئی جب سے شریکِ کارواں ہے
مرے قدموں کے نیچے آسماں ہے

ہماری آرزو کا امتحاں ہے
چلو دیکھیں کہاں تک آسماں ہے

آج سوچا تو آنسو بھر آئے
مدتیں ہو گئیں مسکرائے

ہر قدم پر ادھر مڑ کے دیکھا
اس کی محفل سے ہم اٹھ تو آئے

رہ گیا درد بن کے سراپا
درد دل میں چھپائے چھپائے

دل کی نازک رگیں ٹوٹتی ہیں
یاد اتنا بھی کوئی نہ آئے

اندھیرے ڈھونڈھتے ان کو پہونچ گئے گھر تک
جو گھر میں بیٹھ رہے اور روشنی کر لی

اب آگے جو بھی ہو انجام دیکھا جائے گا
خدا تراش لیا اور بندگی کر لی

لائی پھر اک لغزشِ مستانہ تیرے شہر میں
پھر بنیں گی مسجدیں میخانہ تیرے شہر میں

آج پھر ٹوٹیں گی تیرے گھر کی نازک کھڑکیاں
آج پھر دیکھا گیا دیوانہ تیرے شہر میں

ننگی سڑکوں پر بھٹک کے دیکھ جب آتی ہے رات
رینگتا ہے ہر طرف ویرانہ تیرے شہر میں

دور تک چھائے تھے خشک سائے
ہم اس آنگن سے دھوپ اٹھا لائے

ایسے لمحے بھی عشق میں آئے
حسن سے ناز ہم نے اٹھوائے

حاصلِ زندگی ہے اک وہ رات
چاند باہوں میں جب پگھل جائے

پتھر کے خدا وہاں بھی پائے
ہم چاند سے آج لوٹ آئے

دیواریں تو ہر طرف کھڑی ہیں
کیا ہو گئے مہربان سائے

جنگل کی ہوائیں آ رہی ہیں
کاغذ کا یہ شہر اڑ نہ جائے

وہ بھی سراہنے لگے اربابِ فن کے بعد
داد سخن ملی مجھے ترکِ سخن کے بعد

اعلانِ حق میں خطرۂ دار و رسن تو ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ دار و رسن کے بعد

انساں کی خواہشوں کی کوئی انتہا نہیں
دو گز زمیں بھی چاہیے دو گز کفن کے بعد

ہونٹوں کو سی کے دیکھیے پچھتائیے گا آپ
ہنگامے جاگ اٹھتے ہیں اکثر گھٹن کے بعد

دستور کیا یہ شہر ستمگر کے ہو گئے
جو سر اٹھا کے نکلے تھے بے سر کے ہو گئے

یہ شہر تو ہے آپ کا آواز کس کی تھی
دیکھا جو ہم نے مڑ کے تو پتھر کے ہو گئے

جب سر ڈھنکا تو پاؤں کھلے پھر یہ سر کھلا
ٹکڑے اسی میں پرکھوں کی چادر کے ہو گئے

ہم پر بہت ہنسے تھے فرشتے سو دیکھ لیں
ہم پھر قریب گنبدِ بے در کے ہو گئے

دل سے خلشِ دردِ جدائی نہیں جاتی
وہ آئے ہیں اور آنکھ ملائی نہیں جاتی

خار و خس تو اٹھیں راستہ تو چلے
میں اگر تھک گیا قافلہ تو چلے

اتنی لاشیں میں کیسے اٹھا پاؤں گا
آپ اینٹوں کی حرمت بچا تو چلے

بیلچے لاؤ، کھولو زمیں کی تہیں
میں کہاں دفن ہوں کچھ پتہ تو چلے

ایک روٹی کے تعاقب میں چلا ہوں اتنا
کہ مرا پاؤں کسی اور ہی کا پاؤں لگے

جیسے دیہات میں لوں لگتی ہے چرواہوں کو
بمبئی میں یونہی تاروں کی حسیں چھاؤں لگے

دال روٹی کی طلب جس کو کچل دیتی ہے
اس کی للکار بھی اک سہمی ہوئی میاؤں لگے

کہیں سے لوٹ کے ہم لڑکھڑائے ہیں کیا کیا
ستارے زیرِ قدم رات آئے ہیں کیا کیا

نشیبِ ہستی سے افسوس ہم ابھر نہ سکے
فرازِ دار سے پیغام آئے ہیں کیا کیا

چھٹا جہاں سے اس آواز کا گھنا بادل
وہیں سے دھوپ نے تلوے جلائے ہیں کیا کیا

ہاتھ آکر لگا گیا کوئی
میرا چھپر اٹھا گیا کوئی

لگ گیا اک مشین میں میں بھی
شہر میں لے کے آ گیا کوئی

میں کھڑا تھا کہ پیٹھ پر میری
اشتہار اک لگا گیا کوئی

دل غم سے جل رہا ہے جلے پر دھواں نہ ہو
ممکن ہے اس کے بعد کوئی امتحاں نہ ہو

دنیا تو کیا خدا سے بھی گھبرا کے کہہ دیا
وہ مہرباں نہیں تو کوئی مہرباں نہ ہو

خدا ہمیشہ ترے گلستاں کو مہکائے
گئے تھے پھول کی چاہت میں زخم کھا آئے

تری نظر نے بہت کچھ جہاں میں دیکھ لیا
خدا کرے اسے دل کی پرکھ بھی آ جائے

نیا حسن

کتنی رنگیں ہے فضا کتنی حسیں ہے دنیا
کتنا سرشار ہے ذوقِ چمن آرائی آج

اس سلیقے سے سجائی گئی بزم گیتی
تو بھی دیوارِ اجنتا سے اتر آئی آج

رونمائی کی یہ ساعت یہ تہی دستیٔ شوق
نہ چرا سکتا ہوں آنکھیں نہ ملا سکتا ہوں

پیار سوغات، وفا نذر، محبت تحفہ
یہی دولت ترے قدموں پہ لٹا سکتا ہوں

کب سے تخئیل میں لرزاں تھا یہ نازک پیکر
کب سے خوابوں میں مچلتی تھی جوانی تیری

میرے افسانے کا عنوان بنی جاتی ہے
ڈھل کے سانچے میں حقیقت کے کہانی تیری

مرحلے جھیل کے نکھرا ہے مذاقِ تخلیق
سعیٔ پیہم نے دیئے ہیں یہ خدوخال تجھے

زندگی چلتی رہی کانٹوں پہ، انگاروں پر
جب ملی اتنی حسیں اتنی سبک چال تجھے

تیری قامت میں ہے انساں کی بلندی کا وقار
دخترِ شہر ہے، تہذیب کا شہکار ہے تو

اب نہ جھپکے گی پلک، اب نہ ہٹیں گی نظریں
حسن کا میرے لیے آخری معیار ہے تو

یہ ترا پیکرِ سیمیں، یہ گلابی ساڑی
دستِ محنت نے شفق بن کے اڑھا دی تجھ کو

جس سے محروم ہے فطرت کا جمالِ رنگیں
تربیت نے وہ لطافت بھی سکھا دی تجھ کو

آگہی نے تری باتوں میں کھلائیں کلیاں
علم نے شکّریں لہجے میں نچوڑے انگور

دل ربائی یہ انداز کسے آتا تھا
تو ہے جس سانس میں نزدیک اسی سانس میں دور

یہ لطافت، یہ نزاکت، یہ حیا، یہ شوخی
سونے جلتے ہیں اُمڈی ہوئی ظلمت کے خلاف

لبِ شاداب پہ چھلکی ہوئی گلنار ہنسی
اک بغاوت ہے یہ آئینِ جراحت کے خلاف

حوصلے جاگ اُٹھے سوزِ یقیں جاگ اٹھا
نگہِ ناز کے بے نام اشاروں کو سلام

تو جہاں رہتی ہے اس ارضِ حسیں پر سجدہ
جن میں تو ملتی ہے ان راہگذاروں کو سلام

آ قریب آ کہ یہ جوڑا میں پریشاں کر دوں
تشنہ کامی کو گھٹاؤں کا پیام آ جائے

جس کے ماتھے سے اُبھرتی ہیں ہزاروں صبحیں
میری دنیا میں بھی ایسی کوئی شام آ جائے

○

کبھی جمود کبھی صرف انتشار سا ہے
جہاں کو اپنی تباہی کا انتظار سا ہے

منو کی مچھلی نہ کشتیِ نوح اور یہ فضا
کہ قطرے قطرے میں طوفان بیقرار سا ہے

میں کس کو اپنے گریباں کا چاک دکھلاؤں
کہ آج دامنِ یزداں بھی تار تار سا ہے

سجا سنوار کے جس کو ہزار ناز کئے
اسی پہ خالقِ کونین شرمسار سا ہے

تمام جسم ہے بیدار فکر خوابیدہ
دماغ پچھلے زمانے کی یادگار سا ہے

سب اپنے پاؤں پہ رکھ رکھ کے پاؤں چلتے ہیں
خود اپنے دوش پہ ہر آدمی سوار سا ہے

جسے پکارئیے ملتا ہے اک کھنڈر سے جواب
جسے بھی دیکھئے ماضی کا اشتہار سا ہے

ہوئی تو کیسے بیاباں میں آکے شام ہوئی
کہ جو مزار یہاں ہے مرا مزار سا ہے

کوئی تو سود چکائے کوئی تو ذمّہ لے
اُس انقلاب کا جو آج تک ادھار سا ہے

○

○

جب بھی چوم لیتا ہوں ان حسین آنکھوں کو
سو چراغ اندھیرے میں جھلملانے لگتے ہیں
پھول کیا، شگوفے کیا، چاند کیا، ستارے کیا
سب رقیب قدموں پر سر جھکانے لگتے ہیں
رقص کرنے لگتی ہیں مورتیں اجنتا کی
مدّتوں کے لب بستہ غار گانے لگتے ہیں
پھول کھلنے لگتے ہیں اجڑے اجڑے گلشن میں
پیاسی پیاسی دھرتی پر ابر چھانے لگتے ہیں
لمحے بھر کو یہ دنیا ظلم چھوڑ دیتی ہے
لمحے بھر کو سب پتھر مسکرانے لگتے ہیں

○

پروفیسر عبدالباری

البدور البازغہ کا مطالعہ

ایک زاویۂ نظر

'وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون' کہہ کر اللہ تبارک وتعالی نے حتمی طور پر بتا دیا کہ مقصدِ حیاتِ انسانی صرف اللہ کی اطاعت و بندگی میں ہے۔ قرآن مجید کی ایک دوسری آیت 'و لذکر اللہ اکبر' سے بھی یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ انسانی زندگی میں سب سے بڑی اور سب سے اہمیت والی چیز ذکر اللہ ہی ہے۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی کامیابی کا راز اسی حقیقت کے اعتراف میں پنہاں ہے۔ سچی بندگی کا حق کیوں کر ادا ہو اور انسان 'اشد حباً للہ' کا حقیقی نمونہ کس طرح بن جائے، اس کا نسخہ 'احسان' یا تزکیۂ نفس کی تکمیل بتایا گیا ہے۔

اس مذکورہ بالا پس منظر میں غور کیجئے تو قرآنی نظریۂ احسان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عبودیت کا حق اصلاً احسان کے طریقے کو اپنا کر ہی ادا ہوتا ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ اللہ کی عبودیت اور بندگی میں کچھ ایسا اخلاص پیدا ہو جائے کہ گویا اللہ بندے کو دیکھ رہا ہے یا کم از کم بندے کو یہ احساس رہے کہ جیسے اللہ ہر آن اُسے دیکھ رہا ہے۔ کہتے ہیں یہ چیز تزکیۂ نفس سے آتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ یہ چیز دین کی عملی راہوں سے گذر کر ہی آ پاتی ہے۔ بس اسی صورت حال کو 'احسان' کہتے ہیں۔ تصوف کی دنیا میں احسان یا تکمیل تزکیہ اہم ترین شئے مانی جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی احسان کی ماہیت اور اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ احسان اور متعلقات احسان کی باتیں جہاں انھوں نے مختلف کتابوں میں لکھیں ہیں، وہیں اپنی مشہور کتاب 'البدور البازغہ' میں بھی اس کا قابلِ قدر تذکرہ کیا ہے۔

عام طور پر لوگ 'البدور البازغہ' کو مسائلِ تصوف سے جڑی کتاب نہیں سمجھتے۔ حالانکہ خود شاہ صاحب نے اسے 'تفہیمات الہیہ' کہا ہے، جو توجہ طلب ہے۔ 'حجۃ اللہ البالغہ' اگر بقول شاہ ولی اللہ 'اسرار شریعت' کی کتاب ہے تو 'البدور البازغہ' کو 'اسرارِ دین' کی کتاب کہنے میں کیا دشواری ہو سکتی ہے

اور یہ بات تو ہم سب سمجھ سکتے ہیں کہ 'اسرارِ دین' کی بات اولیت رکھتی ہے، اسرارِ شریعت کی بات بعد میں آتی ہے۔

بہر حال اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ 'البدور البازغہ' خاصی اہمیت کی کتاب ہے اور اس میں مسائلِ تصوف کا بیان بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ مجھے کہہ لینے دیجئے کہ حجۃ اللہ البالغہ کا مطالعہ بغیر 'البدور البازغہ' کی واقفیت کے بڑی حد تک تشنہ سا رہ جاتا ہے۔ شاہ صاحب نے تصوف یا احسان کی باتیں اصلاً 'دینِ حنیف' کے دائرے میں رہتے ہوئے کی ہیں۔ اُن کی فکر کی بنیاد رسول اکرمؐ کی بعثت کے تین اہم کام یعنی تزکیہ، علم قرآنی اور حکمت کی تشریح و توضیح اور اس کی عملی جہتوں کو منکشف کرنا ہے۔ مزید براں یہ بات بھی خاص طور پر دھیان میں رہنی چاہئے کہ ان کے نظریۂ تصوف میں 'احسان' کے ساتھ ساتھ 'ارتفاقات' کے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب کے 'ارتفاقات' کی تھیوری کا تصوف سے امتزاج ہی تصوف کو اس کی بعض ناپسندیدہ شکلوں سے نکال دیتا ہے۔ یہ عام بدگمانی باقی نہیں رہتی کہ تصوف دنیا سے کنارہ کشی سکھاتی ہے۔

شاہ صاحب کی شخصیت اور ان کی کاوشوں کے دائرہ کار کو سمجھنے کے لئے مولانا علی میاں ندویؒ کی تحریر کا ایک اقتباس بڑا ہی نکتہ رس ہے۔ ملاحظہ ہو:

> 'ہر زمانہ میں ایسی طاقتور شخصیتوں اور جامع کمالات داعیوں کی ضرورت رہی ہے جو مسلمانوں میں تلاوت آیات، تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفوس کا کام کریں۔ وہ انقطاعِ نبوت کے بعد رسولؐ کی نیابت کا فرض انجام دیں اور امت اسلامیہ کا رشتہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ جوڑ سکیں اور اس کے میثاق وعہد کی تجدید کریں جو کلمہ اور ایمان کے ذریعہ ہر مسلمان نے کیا ہے اور اطاعت وفرمان برداری، نفس وشیطان کی مخالفت، طاغوت سے انکار اور اللہ کی راہ میں مجاہدہ اور اس عہد کی تجدید اپنا شعار بنائیں جو انھوں نے رسول اللہؐ سے کیا تھا۔ وہ وعظ ونصیحت، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں ایسے منہمک تھے کہ کسی اور چیز کو سوچنے کی بھی انھیں فرصت نہ تھی'۔ (تزکیہ واحسان / مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، لکھنؤ ۱۹۷۹، ص ۲۰)

شاہ ولی اللہ کی ذات کچھ ایسی ہی صفات کی حامل جامع کمالات شخصیت تھی۔ حقیقت بیں

نگاہوں سے دیکھا جائے تو شاہ ولی اللہ عالمی اسلامی برادری میں اپنے وقت کے صفِ اول کے ایک جید عالم، ایک عظیم مفکر اور ایک عظیم مصلحِ قوم تھے۔ انھوں نے اپنی ساری عالمانہ صلاحیتوں کو پورے اخلاص کے ساتھ اسلامی فکر کی ترویج اور اصلاحِ ملتِ بیضاء میں لگا دیا اور عملی اقدامات بھی کئے۔ عملی اقدامات میں اُن کا سب سے بڑا کارنامہ اُن کی بالغ نظری کی عکّاس وہ تصانیف ہیں جو عصری تقاضوں سے ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ مستقبل میں دیرپا اثرات کی حامل ہیں۔

شاہ ولی اللہ کا مطالعہ صرف ایک ہندستانی عالم کی حیثیت سے ہوتا ہے تو یہ بڑی ناانصافی ہوگی۔ وہ بڑی حد تک سرزمین ہند اور یہاں کے مسلمانوں کے ملکی اور ملّی مسائل سے جڑے نظر آتے ہیں لیکن جہاں تک مجموعی حیثیت سے اسرارِ دین اور اسرارِ شریعت کے رموز کی عقدہ کُشائی کا تعلق ہے، ان کے افکار اور ان کی تصانیف کی حیثیت عالمی و آفاقی ہے۔ ایک اہم نکتہ یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ان کی تحریروں کے مجموعی مطالعہ اور ان کی فکر سے ارتباط کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی فکری کاوشوں کے پس منظر میں اصل مقصود اصلاحِ دین اور اصلاحِ معاشرہ ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دین حنیف کو صحیح معنوں میں مسلمانوں کے درمیان اور اسلامی معاشرے میں زندگی اور تابندگی کے ساتھ برپا کرنا ہی شاہ صاحب کی اصل جولان گاہ تھی۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نزول اسلام کے بعد بعض نامساعد حالات اور امتدادِ زمانہ نے مسلم معاشرے میں اضمحلال و انتشار کی شکلیں پیدا کر دی تھیں لیکن قرآن اور اسوۂ رسولؐ اپنی جگہ ہدایت کے مرکز بنے رہے۔ مسئلہ تھا تو صرف حالات زمانہ کے مضر اور منافیِ اسلام اثرات کا اور ملّی زندگی میں افراط و تفریط کے در آنے کا۔ اسی صورت حال نے امت مسلمہ کو انحطاط و انتشار سے دو چار کر رکھا تھا۔ مسئلہ خود اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا نہیں تھا۔ بقول علامہ اقبال مسئلہ صحیح معنوں میں نفس سوختۂ شام و سحر کی تازہ کاری کا تھا۔ یہی وہ پہلو تھا جس کو شاہ ولی اللہ نے ایک خاص رخ سے اپنی کاوشوں کا محور بنایا۔

دین حنیف کی بقا اور اسلامی معاشرے کے حالات زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے اصلاح کا کام علماء نے کیا۔ شاہ ولی اللہ سے پہلے بھی کرتے رہے ہیں۔ خاص طور پر جب دوسری قوموں کے مذہبی افکار اور ثقافت کے اثرات مسلم معاشرے پر پڑنے لگے تو اس کے ازالہ کے لئے 'علم کلام' کا سلسلہ دراز ہوا۔ علم کلام کے مباحث بیش تر یونانی فلسفیانہ افکار کے ارتباط اور ان کے منافی اسلام رجحانات کے رد

کے طور پر سامنے آئے۔ چنانچہ مسلم علماء وفضلاء کا ایک بڑا طبقہ علم کلام کے مباحث میں یونانی فلسفے کے ارتباط سے آگے بڑھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ علماء کا ایک طبقہ ویسا بھی رہا جو اسلامی عقائد اور ثقافت کی محافظت میں دلائل و براہین کی بنیاد فلسفہ سے ہٹ کر صرف قرآن وسنت پر رکھتا رہا۔ شاہ ولی اللہ سے پہلے خود ہندستان میں مُلاّ مخدوم الملک اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ علم کلام کی اس مخصوص روش میں شاہ ولی اللہ بھی شریک ہیں اور یہ بات ایک امتیاز خاص رکھتی ہے۔

شاہ ولی اللہ کی تصانیف کثیرہ میں حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغہ کا مقام ومرتبہ بہت اونچا ہے۔ لیکن عام طور سے البدور البازغہ کے مباحث کا تذکرہ کم سے کم آتا ہے۔ حقیقت میں اگر حجۃ اللہ البالغہ اسرارِ شریعت کی کتاب سمجھی جاتی ہے تو البدور البازغہ کا تعلق اسرارِ دین کے مباحث سے ہے اور اسرارِ دین کا تعلق براہ راست مسائلِ تصوف سے استوار ہو جاتا ہے۔ مزید براں یہاں یہ بات خاص طور پر ذہن نشیں رکھنی چاہئے کہ خود شاہ صاحب نے 'البدور' کو 'تفہیمات الہیہ' کا نام دیا ہے۔

شاہ صاحب کی تصوف اور مسائلِ تصوف سے متعلق بہت ساری کتابیں اور رسائل ہیں لیکن البدور البازغہ کا دوسرا باب خاص طور پر تصوف کے بنیادی مسائل سے جڑا ہے۔ میرے مطالعے میں اس وقت 'البدور' کا وہ نسخہ ہے جو مشہور عالم دین اور عربی ادیب ڈاکٹر صغیر حسن معصومی کی تحقیق اور ایک وقیع مقدمے کے ساتھ کراچی سے ۱۹۷۰ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ کتاب ۳۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کی تحریر عمدہ عربی میں ہے جس سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف برصغیر ہند بلکہ عرب دنیا کو بھی نگاہ میں رکھ کر باتیں کہی گئی ہیں۔

کتاب میں ایک مختصر مقدمہ ہے جس میں حکمت، وجود باری تعالی، اس کی وحدانیت اور اس کے صفات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اسم 'الرحمٰن' ہی دراصل کل موجودات پر حاوی ہے۔ کائنات اسی اسم کے فیض سے چل رہی ہے۔ اسی طرح انسان کے وجود کی بحث ہے۔

مقدمہ کے بعد کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں 'امام انسان' کی بحث کلام پاک کی آیت 'انی جاعل فی الارض خلیفۃ' کی روشنی میں پیش کی گئی ہے اور انسانی خصائص یعنی نفس ناطقہ کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ مگر یہ ساری بحثیں فلسفیوں کے انداز سے ہٹ کر پیش کی گئی ہیں۔ اس کے بعد 'ارتفاقات اربعہ' کی طویل بحث ہے جس میں انسان کی دنیوی حاجات کا ذکر ہے کچھ اس طرح کہ انسانی زندگی کے سبھی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی گوشوں کو احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ وہ بحثیں ہیں جنھیں

پہلی بار عالم اسلام میں ایک نئے زاویۂ نگاہ سے پیش کیا گیا ہے۔ گویا دنیا میں کامیاب انفرادی اور اجتماعی ملّی زندگی کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ امام انسان کو سات اہم ترین اخلاقی قدروں کا حامل ہونا ضروری ہے جس میں 'حکمت' بھی شامل ہے۔

دوسرے باب میں معرفت الٰہی کی بات کی گئی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی فطرت میں حق سے قرب اور باطل سے دوری کی صفت ودیعت ہوتی ہے اور اسی سے انسان اور حیوان میں فرق کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد صفات الٰہی، اسماء حسنیٰ، ایمان کی حقیقت، عبادات واحسان کے باہمی رشتوں کا ذکر ہے۔ یہ وہ خاص مسائل ہیں جو تصوف کے زیر بحث آتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر بہت سے متعلقہ امور پر بحث کی گئی ہے۔

تیسرے باب میں مختلف ملتوں کا ذکر ہے اور شریعت کی حقیقتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور خاص طور پر امت محمدیہ اور دین حنیف کا تذکرہ ہے جس میں ارتفاقات کی روشنی میں دین و دنیا کی کامیابی کے راستوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ بہت ساری وہ بحثیں ہیں جنہیں ان سے پہلے نہیں اٹھایا گیا ہے۔

آخر میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ البدور البازغہ کا مطالعہ شاہ صاحب کے نظریۂ تصوف کے ضمن میں ازبس ضروری ہے۔

====

ڈاکٹر سید مسعود حسن

اردو رسائل کے اشاریوں کا اشاریہ

کتابیات اور اشاریہ جات حوالہ جات خدمات کی اہم شاخ ہیں۔آج کل سب سے زیادہ اہمیت رسائل کے اشاریوں کو دی جارہی ہے۔علم وادب کے ہر موضوع پر ہر زبان کے رسائل میں کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا ہے اوران تمام رسائل تک قاری کی دسترس ممکن نہیں۔ان میں بیشتر مضامین رسائل کے صفحات میں ہی دب کر رہ جاتے ہیں۔لہذا ایس قیمتی مضامین کو کتابی صورت میں آنے موقع کم ہی ملتا ہے۔ایسی صورت میں اردو رسائل کے اشاریے مطلوبہ معلومات تک رسائی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

اردو رسائل کے اشاریے پر جب اظہار خیال کیا جاتا ہے تو ان کی تعداد کے سلسلہ میں عموما مایوسی کا اظہار کیا جاتا ہے۔اس ضمن میں جب میں نے تلاش شروع کی میں کی تو شائع شدہ اور غیر شائع شدہ اشاریوں کی تعداد ۲۳۲ تک پہنچ گئی۔ان میں بیشتر اشاریے خدا بخش لائبریری میں موجود ہیں۔ان کے علاوہ بقیہ اشاریے ہمیں ثانوی مآخذ (تبصرہ کتب، تحقیقی مقالات کی فہرست، رسائل کے اشاریے وغیرہ) سے ملے۔اشاریوں کی یہ تعداد کوئی حتمی تعداد نہیں کیونکہ اور نہ جانے کتنے اشاریوں تک ہماری رسائی نہیں ہوسکی ہو۔

یہاں ان اشاریوں کا اشاریہ پیش خدمت ہے۔اس فہرست میں ایسے اشاریے بھی شامل ہیں جو باضابطہ سائنسی اصول پر مرتب کئے گئے ہیں اور ایسے بھی جن میں صرف فہرست مشتملات کو یکجا کردیا گیا ہے۔اس فہرست میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے ایسے مقالات کی تعداد بھی خاصی ہے جو کسی اردو رسالہ کے اشاریہ پر مبنی ہے۔یونیورسٹی میں مرتب کیے گئے ان اشاریوں میں بیشتر اشاعت کی منزل تک نہیں پہنچ سکے، حالانکہ ترتیب کی خامیوں کے باوجود ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اردو رسائل کے اب تک جتنے اشاریوں کا علم ہوا ہے ان میں سب سے قدیم اشاریہ ''اورینٹل کالج میگزین (لاہور) کا ہے جسے محمد ابراہیم اور سید محمد عبداللہ نے مرتب کیا ہے۔یہ اشاریہ ''اورینٹل کالج

میگزین (لاہور) مئی ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا جو ۱۹۲۵ سے ۱۹۴۱ تک شماروں پر مشتمل ہے۔

کتابی صورت میں شائع ہونے والا پہلا اشاریہ بھی اورینٹل کالج میگزین (لاہور) کا ہے جسے ڈاکٹر بشیر حسین (مرتب) نے ۱۹۷۰ میں لاہور سے شائع کیا۔اس اشاریہ میں ۱۹۲۵ سے ۱۹۶۷ کے شماروں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

ہندوستان میں شائع شدہ دستیاب اشاریوں میں پہلا اشاریہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا مرتب کردہ ''الندوہ'' (لکھنؤ) کا اشاریہ ہے جو ادیب (علی گڑھ) ستمبر ۱۹۶۰ء شبلی نمبر میں شائع ہوا۔اس اشاریہ کے بعد ''برہان'' اور ''اردو ادب'' کے اشاریے شائع ہوئے۔۔اول الذکر ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور آخر الذکر ڈارکٹر انصار اللہ نظر نے مرتب کیا ہے۔ یہ اشاریے ۱۹۶۶ اور ۱۹۶۸ میں شائع ہوئے۔ترتیب کے لحاظ سے برہان کے اشاریہ کی ترتیب سائنٹفک ہے۔

ہندوستان میں کتابی شکل مین شائع ہونے والا پہلا اشاریہ ''رہبر دکن'' (حیدرآباد) کا اشاریہ ہے جسے عبدالرحمٰن نے مرتب کر کے ۱۹۷۹ میں حیدرآباد سے شائع کیا۔

اشاریہ سازی کو کئی یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالہ کا موضوع بنایا گیا ہے۔اس سلسلہ میں سب سے پہلے اورینٹل کالج، لاہور میں ایم۔اے کے مقالہ کے طور پر اردو رسائل کے اشاریے ۱۹۶۳ میں تیار کیے گئے، پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، یونیورسٹی آف حیدرآباد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، کشمیر یونیورسٹی میں اردو رسائل کے اشاریے مرتب کیے گئے۔ان میں کچھ اشاریے تو ہماری نظر سے گذرے لیکن بیشتر کے مآخذ درج ذیل کتابیں ہیں:

۱۔یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی، ادبی اور درسی سرمایہ مرتبہ وحید قریشی۔لاہور: پنجابی ادبی اکادمی، ۱۹۷۰، ۵۵۲ص

۲۔اورینٹل کالج کے موجودہ اساتذہ: کوائف اور علمی خدمات مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، لاہور: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۱۹۹۷، ۱۲۴ص

۳۔ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق مرتبہ شاہانہ مریم شان۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۲، ۴۱۱ص

ہندوستانی جامعات میں تیار گئے اشاریوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

اشاریہ اردوئے معلیٰ (علی گڑھ)، ستمبر ۱۹۰۳۔جون ۱۹۴۰، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۸

اشاریہ شاہراہ (دہلی) ۱۹۴۹۔ستمبر ۱۹۶۰ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۸

اشاریہ نیا دور (کراچی) شمارہ ۱۔۸۲، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۸۸

اشاریہ البلاغ (کلکتہ) ۱۳/جولائی ۱۹۱۲۔۹/دسمبر ۱۹۲۷، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۹

اشاریہ الہلال (کلکتہ) ۱۳/جولائی ۱۹۱۲۔۹/دسمبر ۱۹۲۷، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۹

اشاریہ آجکل (نئی دہلی) ابتدا سے ۱۹۵۰، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۰

اشاریہ مخزن (لاہور)، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۰

اشاریہ تہذیب الاخلاق (علی گڑھ) ۱۸۷۰۔۱۸۷۶، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۱

اشاریہ ساقی (دہلی) ۱۹۳۰۔۱۹۴۰، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۲

اشاریہ ہمایوں (لاہور) ابتدا سے ۱۹۴۷، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۲

اشاریہ علی گڑھ میگزین ۱۹۲۰۔۱۹۶۰، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۲

اشاریہ الناظر (لکھنؤ) ۱۹۰۹۔۱۹۳۷، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۳

اشاریہ معارف (اعظم گڑھ) ۱۹۴۷۔۱۹۷۲، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۴

اشاریہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۸۱۔۱۸۸۵، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۹۵

اشاریہ جامعہ (دہلی) ۱۹۲۳۔۱۹۴۷، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۹۹۵

اشاریہ سب رس (کراچی)، یونیورسٹی آف حیدرآباد، ۱۹۹۵

اشاریہ شب خوں (الہ آباد)، یونیورسٹی آف حیدرآباد، ۱۹۹۵

اشاریہ سب رس (حیدرآباد)، عثمانیہ یونیورسٹی، ۱۹۹۵

اشاریہ فکر و تحقیق (نئی دہلی)، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

اشاریہ مجلّہ عثمانیہ (حیدرآباد) ۱۹۲۷۔۱۹۸۸، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، ۱۹۸۸

اشاریہ ہمارا ادب (سری نگر)، کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۹۱

پاکستانی جامعات میں تیار کیے گئے اشاریے:

اشاریہ اورینٹل کالج میگزین (لاہور) ۱۹۲۵۔۱۹۴۰، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۳

اشاریہ ہمایوں (لاہور) ۱۹۲۲۔۱۹۵۸، اورینٹل کالج، لاہور ۱۹۸۵

اشاریہ ہندستانی (الہ آباد)، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۵

اشاریہ برہان (دہلی) جنوری ۱۹۵۲۔ جون ۱۹۶۵، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۵

اشاریہ جامعہ (دہلی) جنوری ۱۹۳۷۔ جون ۱۹۴۷، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۵

اشاریہ صدق جدید (لکھنؤ)، ۱۹۵۰۔۱۹۶۰، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۷

اشاریہ معارف (اعظم گڑھ) ۱۹۱۶۔۱۹۳۰، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۷۳

اشاریہ سیارہ (لاہور) اگست ۱۹۶۲۔ فروری ۱۹۷۲، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۸۷

اشاریہ اقبال ریویو (لاہور)، ۱۹۷۶۔۱۹۸۶، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۸۷

اشاریہ نیا دور (کراچی)، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۸۳

اشاریہ اقبالیات/اقبال ریویو (لاہور) اپریل ۱۹۶۰۔ ستمبر ۱۹۹۴، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۹۷

بعض اردو رسائل ایسے بھی ہیں جن کے ایک سے زیادہ اشاریے تیار کیے گئے ان میں اورینٹل کالج میگزین، جامعہ، معارف اور ہمایوں قابل ذکر ہیں۔

اردو رسائل کی اشاریہ سازی میں خدا بخش لائبریری کا اہم مقام ہے۔ وقتاً فوقتاً یہاں سے اردو رسائل کے اشاریے شائع ہوتے رہے ہیں ۔۔ خدا بخش لائبریری کے ذریعہ شائع کیے گئے اشاریوں میں برہان (دہلی)، جامعہ (نئی دہلی)، خدا بخش لائبریری جرنل، سوغات (بنگلور)، عصری ادب (نئی دہلی)، معاصر (پٹنہ)، نقد و نظر (علی گڑھ)، نیا دور (کراچی)، نگار (لکھنؤ) قابلذکر ہیں۔

ان کے علاوہ خدا بخش فیلوشپ/اورینٹل لائبریرین شپ کے تحت تیار کیے گئے زبان و ادب (پٹنہ)، صحیفہ (لاہور)، قومی زبان (کراچی)، ہندستانی (الہ آباد)، ندیم (گیا)، اپنچ (پٹنہ)، صبح نو (پٹنہ)، روح ادب (کلکتہ) کے اشاریے ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔

اس فہرست میں ان اشاریوں کو ہی شامل کیا گیا ہے جو کسی ایک رسالہ کے اشاریہ پر مبنی ہیں۔ مجموعی رسائل کے اشاریے مثلاً قومی زبان (کراچی) میں شائع ہونے والا اشاریہ ''رفتار ادب'' اور ''نوائے ادب (بمبئی) میں شائع ہونے والا اشاریہ ''مقالہ نما'' شامل نہیں ہیں۔

اس فہرست میں میں اشاریہ کا وہی عنوان دیا گیا ہے جس عنوان سے یہ اشاریہ شائع ہوا ہے۔ عنوان اشاریہ کے بعد قوسین میں اس عہد کا ذکر کیا گیا ہے جس عہد کو یہ اشاریہ احاطہ کرتا ہے۔ بعض ثانوی مآخذ میں عہد اشاریہ درج نہ ہونے کی وجہ کر یہ اطلاع نہیں دی جا سکی ہے۔

یہاں ان اشاریوں کی ترتیب کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ویسے اشاریہ خواہ موضوع وار، مصنف

وار یا عنوان وار ہوں۔ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔حتی کے صرف شمارہ وار فہرست مشتملات پر مشتمل اشاریہ بھی اہم ہے کیونکہ اس رسالہ سے کسی خاص مضمون کے متلاشی کو یہ اشاریہ تمام فائلوں کو دیکھنے کی زحمت سے محفوظ رکھتا ہے۔ویسے ترتیب کے لحاظ سے معارف مرتبہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار، جامعہ مرتبہ ڈاکٹر شعائر اللہ خاں، مخزن مرتبہ جاوید اختر اور نگار مرتبہ عطا خورشید قابل تقلید ہیں۔

اردو رسائل کے اب تک جتنے اشاریے شائع ہوئے ہیں ان میں بیشتر رسائل میں شائع ہوئے ہیں ۔کتابی صورت میں شائع ہونے والے اشاریوں کی تعداد ہماری معلومات کی حد تک ۴۷ ہے۔کتابی صورت میں شائع ہونے والے اشاریوں کو فہرست میں نشان زد (*) کر دیا گیا ہے۔جو اشاریہ شائع نہیں ہوا ہے اس کے آگے زیر طبع رغیر مطبوعہ لکھ دیا گیا ہے۔کتابی صورت میں شائع ہونے سے مراد یہ ہے کہ جو علاحدہ کتابی شکل میں شائع ہوئے ہوں، مجموعہ مضامین، رسائل کے انتخاب کے ساتھ شائع ہونے والے اشاریے مثلاً زبان، العصر، تحریر اور ہمدرد وغیرہ۔

اردو رسائل کی اشاریہ سازی میں درج ذیل رسائل کا ہنوز اشاریہ تیار نہین کیا گیا ہے۔ان مؤقر رسائل کے اشاریہ سازی کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ادب لطیف (لاہور)	افکار (کراچی)	سہیل (گیا)
سیپ (کراچی)	عالمگیر (لاہور)	عصمت (دہلی)
الفرقان (لکھنؤ)	فنون (کراچی)	کتاب (لکھنؤ)

اردو رسائل کے اشاریوں کے اشاریہ کا کام جنوری ۱۹۹ میں شروع کیا گیا تھا۔اس اشاریہ کی پہلی فہرست اردو بک ریویو (نئی دہلی) جولائی۔اگست ۱۹۹۸ء میں شائع

ہوئی جس میں ۱۱۲ اشاریوں کا اشاریہ پیش کیا گیا تھا۔اس اشاعت کے بعد اس فہرست میں مزید اضافے ہوتے رہے۔یہ اضافہ شدہ فہرست اخبار ادرو (اسلام آباد) فروری ۲۰۰۹ء

اور فکر و تحقیق (نئی دہلی) جنوری۔مارچ ۲۰۱۰ میں شائع ہوئی جس میں اشاریوں کی تعداد ۴۴ تھی۔اسکی تازہ اضافہ شدہ ۲۳۶ اشاریوں کی فہرست پیش خدمت ہے۔امید ہے یہ اشاریہ حوالہ جاتی خدمات میں معاون ثابت ہوگا۔

سید مسعود حسن

O

*۱۔ آجکل (نئی دہلی)، اشاریہ آجکل، جلد اول (۱۹۴۲ تا ۱۹۸۶)، مرتبہ جمیل اختر، نئی دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۸۸، ۶۸۳ص۔

*۲۔ آجکل (نئی دہلی)، اشاریہ آجکل، جلد دوم (۱۹۴۲ تا ۲۰۰۰) بہ لحاظ موضوع و مصنف، مرتبہ جمیل اختر، دہلی: انٹرنیشنل اردو فاؤنڈیشن، ۲۰۰۲، ۱۱۵۸ص۔

۳۔ آجکل (نئی دہلی)، آجکل کا توضیحی اشاریہ (ابتدا سے ۱۹۵۰ تک) مرتبہ محمد نعمت، علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۰ء، ۳۰۹ص (مقالہ ایم فل، غیر مطبوعہ)

۴۔ آجکل (نئی دہلی)، اشاریہ ماہنامہ آجکل (نئی دہلی) مرتبہ محمد کاظم۔ اردو بک ریویو (نئی دہلی) مئی۔ جون ۲۰۰۲، ص ۵۵

۵۔ آموزگار (جلگاؤں)، فہرست مضامین آموزگار (جلگاؤں): مارچ ۱۹۸۲ تا فروری ۱۹۸۵۔ آموزگار (جلگاؤں) مارچ۔ مئی، اگست، اکتوبر۔ نومبر ۱۹۸۵ء۔

۶۔ آہنگ (گیا)، ماہنامہ آہنگ میں شائع شدہ تخلیقات کا گوشوارہ مرتبہ محمد ثنی۔ آہنگ (گیا) جون، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۴، مارچ ۱۹۸۵ء

۷۔ آیات (علی گڑھ)، مکمل فہرست مجلّہ آیات (۱۹۹۰ تا ۱۹۹۵) مرتبہ ادارہ مرکز الدراسات العلمیہ، علی گڑھ۔ آیات (علی گڑھ) ستمبر، دسمبر ۱۹۹۰، ستمبر، دسمبر ۱۹۹۱، ستمبر، دسمبر ۱۹۹۲، ستمبر، دسمبر ۱۹۹۳، مئی۔ دسمبر ۱۹۹۵ء

۸۔ اخبار اردو (اسلام آباد)، موضوعاتی اشاریہ مضامین اخبار اردو (اسلام آباد) (جولائی ۱۹۸۱ تا جون ۲۰۰۱) مرتبہ عقیل عباس جعفری، محمد اسلم کمال، اخبار اردو (اسلام آباد) جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۱ء

*۹۔ اخبار اردو (اسلام آباد)، اشاریہ اخبار اردو (اسلام آباد) جولائی ۱۹۸۱۔ دسمبر ۲۰۰۹ مرتبہ محمد اشرف کمال۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰، ۴۶۳ص

۱۰۔ ادیب (علی گڑھ)، گزشتہ تین برسوں کے مضامین کا اشاریہ (۱۹۸۱ تا ۱۹۸۳) مرتبہ غلام السلام

انصاری،ادیب(علی گڑھ)جولائی۔دسمبر۱۹۸۴

۱۱۔ ادیب(الہ آباد)،رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت(جلد اول):ادیب(الہ آباد) ۱۹۱۰تا۱۹۱۳،مرتبہ عابدرضا بیدار، پٹنہ: خدابخش لائبریری،۱۹۸۰،۴۲۳ص۔

۱۲۔ اردو(اورنگ آباد/کراچی)،اشاریہ اردو(۱۹۲۱ تا ۱۹۶۰) مرتبہ سید سرفراز علی رضوی،کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۷۶،۱۴۰ص۔

۱۳۔ اردو ادب(علی گڑھ)،اشاریہ اردو ادب(۱۹۵۰ تا ۱۹۶۷)۔ مرتبہ انصار اللہ نظر،اردو ادب(علی گڑھ)شمارہ ۱۔۴،۱۹۶۸ء

۱۲۔ اردو بک ریویو(نئی دہلی)،اشاریہ اردو بک ریویو(۱۹۹۵ تا ۱۹۹۸) مرتبہ عارف اقبال،اردو بک ریویو(نئی دہلی)جنوری۔فروری۱۹۹۷،ص۶۳،جنوری۔فروری۱۹۹۸،ص۹۳

۱۵۔ اردو بک ریویو(نئی دہلی)،اشاریہ اردو بک ریویو(۲۰۰۰۔۲۰۰۲) مرتبہ عارف اقبال/پروین سلطانہ،اردو بک ریویو(نئی دہلی) جنوری۔فروری۲۰۰۱،ص۵۷،جنوری۔فروری۲۰۰۲،ص ۶۵،مارچ۔اپریل۲۰۰۳،ص۷۹

۱۶۔ اردو بک ریویو(نئی دہلی)،اشاریہ اردو بک ریویو(۲۰۰۳۔۲۰۰۵) مرتبہ سعید اختر اعظمی،اردو بک ریویو(نئی دہلی)جنوری۔فروری۲۰۰۴،ص۲۳،جنوری۔فروری ۲۰۰۵،ص۱۹،جنوری۔فروری۲۰۰۶،ص۲۳

۱۷۔ اردو بک ریویو(نئی دہلی)،اشاریہ اردو بک ریویو(۲۰۰۷۔۲۰۰۸) مرتبہ سعید اختر اعظمی۔اردو بک ریویو(نئی دہلی)جنوری۔مارچ۲۰۰۸،ص۲۳،جنوری۔مارچ۲۰۰۹،ص۹

۱۸۔ اردو بک ریویو(نئی دہلی)،اشاریہ اردو بک ریویو(۲۰۰۹) مرتبہ ذاکر حسین اصلاحی۔اردو بک ریویو(نئی دہلی)جنوری۔فروری۲۰۱۰،ص۱۵

۱۹۔ اردو بک ریویو(نئی دہلی)،اشاریہ اردو بک ریویو(۲۰۱۰۔۲۰۱۱) مرتبہ سعید اختر اعظمی۔اردو بک ریویو(نئی دہلی)اپریل۔جون۲۰۱۱، ص۲۱،اپریل۔جون۲۰۱۲،ص۸۵

۲۰۔ اردو بک ریویو(نئی دہلی)،اشاریہ اردو بک ریویو(۲۰۱۴۔۲۰۱۷) مرتبہ سعید اختر اعظمی۔اردو بک ریویو(نئی دہلی) جولائی۔ اگست ۲۰۱۵ ،ص۸۳، اپریل۔جون ۲۰۱۶، ص ۸۷،

جنوری۔ مارچ ۲۰۱۷،ص ۸۷،اپریل۔جون ۲۰۱۸،ص ۸۷

*۲۱۔ اردو سائنس ،اشاریہ اردو سائنس ماہنامہ مرتبہ ڈاکٹر محمد کاظم۔ دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۷،۴۵۴ص

*۲۲۔ اردو نامہ(کراچی)،اشاریہ اردو نامہ(۱۹۶۰ تا ۱۹۷۷) مرتبہ مصباح العثمان، کراچی:اردو ڈکشنری بورڈ، ۱۹۹۷،۱۲۸ص۔

۲۳۔ اردوئے معلّی (علی گڑھ)،اردوئے معلّی کے مضامین کی فہرست مرتبہ محمد ضیاءالدین انصاری، آجکل (نئی دہلی)حسنر نمبر اگست ستمبر ۱۹۸۱،ص ۶۶

۲۴۔ اردوئے معلّی (علی گڑھ)،اردوئے معلّی کا توضیحی اشاریہ(ستمبر ۱۹۰۳ تا جون ۱۹۴۰)۔مرتبہ محمد عاقل خاں،علی گڑھ:علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،۱۹۸۸،۲۹۳ص (مقالہ ایم فل،غیر مطبوعہ)

۲۵۔ اردوئے معلّی (علی گڑھ)،اردوئے معلّی کے کچھ شماروں کی فہرست مضامین مرتبہ نصر اللہ۔ اکادمی (لکھنؤ) جولائی۔اگست ۱۹۸۴،ص ۹۳

۲۶۔ اسلام اور عصر جدید(نئی دہلی)،اشاریہ سہ ماہی اسلام اور عصر جدید(۱۹۶۹ تا ۱۹۹۷) مرتبہ محمد عرفان۔اسلام اور عصر جدید(نئی دہلی) جنوری ۱۹۸۶۔جنوری ۱۹۹۳،اکتوبر ۱۹۹۶،اپریل ۱۹۹۸ء

۲۷۔ اسلامی تعلیم (لاہور)،اشاریہ دو ماہی اسلامی تعلیم (جنوری ۱۹۷۲۔اپریل ۱۹۷۷) مرتبہ سفیر اختر۔نقطہ نظر (اسلام آباد) اکتوبر ۲۰۰۶۔ستمبر ۲۰۰۷ء

۲۸۔ اشتراکی دنیا کے مسلمان (اسلام آباد)،اشاریہ اشتراکی دنیا کے مسلمان (۱۹۹۱) مرتبہ ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز،اسلام آباد۔وسطی ایشیا کے مسلمان (اسلام آباد) نومبر،دسمبر ۱۹۹۳ء

۲۹۔ اشراق (لاہور)،اشاریہ ماہنامہ اشراق(۱۹۹۶ تا ۱۹۹۷)،مرتبہ محمد ساجد بھٹی و جاوید اشرف۔اشراق (لاہور) دسمبر ۱۹۹۶،دسمبر ۱۹۹۷ء

۳۰۔ اشرفیہ(مبارکپور)،اشاریہ اشرفیہ(جلد ۱۔۲۳، ۱۹۷۶۔۱۹۹۸) مرتبہ سید ساجد رضا مصباحی/ محمد قطب الدین رضا مصباحی۔اشرفیہ(مبارکپور) اگست ۲۰۰۷۔نومبر ۲۰۰۹ء

۳۱۔ الاعتصام(لاہور)،اشاریہ مضامین ہفت روزہ الاعتصام(اگست ۱۹۸۴ ۔جولائی ۱۹۸۵، جنوری۔دسمبر ۱۹۸۸)۔الاعتصام(لاہور) ۲۶/جولائی ۱۹۸۵،ص ۳،۱۶/دسمبر ۱۹۸۸،ص ۱

۳۲۔ افکار رضا(ممبئ)،افکار رضا(ممبئ) کے رنگ ڈھنگ(شمارہ ا۔۴۹، جالائی ۱۹۹۵۔ستمبر ۲۰۰۷)مرتبہ سید صابر حسین شاہ بخاری۔افکار رضا(ممبئ)اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۷،ص ۴۴۵

*۳۳۔ اقبال(لاہور)،اشاریہ سہ ماہی اقبال(اکتوبر ۱۹۵۲ تا جن ۱۹۹۲)مرتبہ اختر النساء،لاہور: بزم اقبال،۱۹۹۴، ۲۶۲ص۔

۳۴۔ اقبال ریویو(لاہور)،وضاحتی فہرست(۱۹۷۶ تا ۱۹۸۶) مرتبہ شکیلہ یاسمین علوی،لاہور: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج،۱۹۸۷،(مقالہ ایم۔فل غیر مطبوعہ)

۳۵۔ اقبالیات(سرینگر)،اقبالیات کے مشتملات کا اشاریہ(۱۹۸۱تا۱۹۸۹)مرتبہ جاوید اشرف،خدا بخش لائبریری جرنل(پٹنہ)شمارہ ۶۳۔۶۸،ص ۷۹۷، اقبال(لاہور)جنوری ۱۹۹۳ء

۳۶۔ اقبالیات/اقبال ریویو(لاہور)،وضاحتی فہرست مجلّہ اقبالیات/اقبال ریویو(۱۹۸۷تا۱۹۹۸) مرتبہ ہاجرہ عرفان،لاہور: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج،۱۹۹۷،(مقالہ ایم۔فل غیر مطبوعہ)

*۳۷۔ اقبالیات /اقبال ریویو(لاہور)،اشاریہ اقبالیات/اقبال ریویو(اپریل ۱۹۶۰ تا ستمبر ۱۹۹۴)مرتبہ اختر النساء،لاہور:اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۹۸،۴۱۶ص۔

*۳۸۔ اوراق(لاہور)،اوراق کا اشاریہ(آغاز سے اختتام)مرتبہ محمود احمد اسیر۔فیصل آباد: مثال پبلشرز،۲۰۱۷،۲۵۴ص

۳۹۔ اورینٹل کالج میگزین(لاہور)،وضاحتی فہرست مقالات اورد اورینٹل کالج میگزین(۱۹۲۵ تا ۱۹۴۰)مرتبہ عبدالباری،لاہور: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج،۱۹۶۳،(مقالہ ایم۔فل غیر مطبوعہ)

۴۰۔ اورینٹل کالج میگزین(لاہور)،وضاحتی فہرست مقالات اورد،عربی،فارسی،اورفارسی اورینٹل کالج میگزین (۱۹۴۵ تا ۱۹۴۶) (کذا) مرتبہ محمد رمضان ایوب،یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور،۱۹۶۵(مقالہ ایم۔اے۔غیر مطبوعہ)

۴۱۔ اورینٹل کالج میگزین(لاہور)،فہارس اورینٹل کالج میگزین(۱۹۲۵ تا ۱۹۴۱)مرتبہ محمد ابراہیم و محمد عبداللہ،اورینٹل کالج میگزین(لاہور)مئی ۱۹۴۲ء

۴۲۔ اورینٹل کالج میگزین(لاہور)،فہارس اورینٹل کالج میگزین(۱۹۴۲ تا ۱۹۵۷)مرتبہ ادارہ، اورینٹل کالج میگزین(لاہور)فروری،مئی ۱۹۵۸ء خاص نمبر

*۴۳۔ اورینٹل کالج میگزین (لاہور)، فہارس اورینٹل کالج میگزین (۱۹۲۵ تا ۱۹۶۷) مرتبہ محمد بشیر حسین، لاہور: ۱۹۷۰، ۱۰۹ص۔

۴۴۔ ایوان اردو (نئی دہلی)، اشاریہ ایوان اردو (مئی ۱۹۸۷ تا اپریل ۱۹۹۲) مرتبہ محمد فاروق انصاری، ایوان اردو (نئی دہلی) فروری۔ستمبر ۱۹۹۲

*۴۵۔ ایوان اردو (نئی دہلی)، اشاریہ ایوان اردو (مئی ۱۹۸۷ تا اپریل ۱۹۹۲) مرتبہ محمد فاروق انصاری، دہلی: مرتب، ۱۹۹۳، ۱۸۹ص۔

*۴۶۔ برہان (دہلی)، علوم اسلامیہ کا انسائیکلوپیڈیا: برہان (۱۹۳۸ تا ۱۹۶۵) مرتبہ عابد رضا بیدار وشائستہ خاں، پٹنہ: خدا بخش لائبریری، ۱۹۹۶، ۸۰ص۔

۴۷۔ برہان (دہلی)، وضاحتی فہرست برہان (جنوری ۱۹۵۲ تا جون ۱۹۶۵) مرتبہ مسرور کیفی، یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۵، (مقالہ ایم۔اے۔غیر مطبوعہ)

۴۸۔ البلاغ (کلکتہ)، الہلال اور البلاغ کا توضیحی اشاریہ (۱۳/جولائی ۱۹۱۲ تا ۹/دسمبر ۱۹۲۷) مرتبہ سید حامد علی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۸۹، ۴۴۸ص۔ (مقالہ ایم۔فل غیر مطبوعہ)

۴۹۔ الپنچ (پٹنہ)، اشاریہ الپنچ (۱۸۹۸۔۱۹۰۶) مرتبہ تسنیم فاطمہ (مخزونہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ، غیر مطبوعہ)

۵۰۔ پیام تعلیم (نئی دہلی)، پیام تعلیم کا وضاحتی اشاریہ مرتبہ محمد علیم الدین۔حیدرآباد: حیدرآباد یونیورسٹی، ۲۰۱۰، (مقالہ ایم۔فل غیر مطبوعہ)

۵۱۔ پیش رفت (دہلی)، پیش رفت (اگست ۱۹۹۳ تا ستمبر ۱۹۹۶) کے موضوعاتی اشاریے مرتبہ محمد بدیع الزماں، پیش رفت (دہلی) جنوری فروری ۱۹۹۷ء

۵۲۔ پیغام (کلکتہ)، فہرست مضامین ہفتہ وار پیغام ۱۹۲۱، مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری، مشمولہ ''مولانا ابوالکلام آزاد کا ہفتہ وار پیغام''، پٹنہ: خدا بخش لائبری، ۱۹۸۹، ص ۲۱۶

۵۳۔ تاریخ و سیاسیات (کراچی)، اشاریہ مضامین سہ ماہی تاریخ و سیاسیات مرتبہ ابوسان شاہجہانپوری قومی زبان (کراچی) اگست ۱۹۷۵، ص ۵۷۔

۵۴۔ تجلی، رسالہ تجلی کے مضامین کا وضاحتی اشاریہ مرتبہ محمد اسجاد۔حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی (مقالہ پی ایچ ڈی)

۵۵۔ تحریر(نئی دہلی)، مالک رام کا تماہی تحریر(۱۹۶۷ تا ۱۹۷۸) مرتبہ عطا خورشید، اردو ادب(نئی دہلی) شمارہ ا، ۱۹۸۷،ص ۷۔

۵۶۔ تحریر(نئی دہلی)، سہ ماہی تحریر تعارف اور مندرجات کا اشاریہ(۱۹۶۷ تا ۱۹۷۸) مرتبہ ضیاء الدین انصاری، مشمولہ ''مالک نامہ'' مرتبہ کرنل بشیر حسین زیدی۔ دہلی، ۱۹۸۷،ص ۱۵۷۔

*۵۷۔ تحریک(دہلی)، اشاریہ ماہنامہ تحریک(مارچ ۱۹۵۳۔ جون ۱۹۸۱) مرتبہ مطیع اللہ خاں۔ نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۱، ۴۳۲ص۔

۵۸۔ تحقیق(جام شورو، سندھ)، شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی جام شورو کے شعبہ جاتی مجلّے تحقیق کا اشاریہ(شمارہ ا۔۱۳) مرتبہ ادارہ۔ نقد و نظر(اسلام آباد) شمارہ ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۸۔ مارچ ۲۰۰۹ء

۵۹۔ تحقیقات اسلامی(علی گڑھ)، فہرست مضامین تحقیقات اسلامی(۱۹۸۲ تا ۱۹۹۷) مرتبہ ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ: تحقیقات اسلامی، تحقیقات اسلامی(علی گڑھ) اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۸۲۔ اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۷

۶۰۔ تحقیقات اسلامی(علی گڑھ)، فہرست مضامین تحقیقات اسلامی(۲۰۰۱۔۲۰۰۲) مرتبہ ادارہ، اردو بک ریویو(نئی دہلی) جولائی۔ اگست ۲۰۰۲،ص ۱۷، مئی۔ جون ۲۰۰۳،ص ۲۲

۶۱۔ تدبّر(لاہور)، اشاریہ تدبّر(شمارہ ا تا ۵۰) مرتبہ سید اسحاق علی، تدبّر(لاہور) جولائی ۱۹۹۵،ص ۴۹۔

*۶۲۔ ترجمان القرآن(حیدر آباد/لاہور)، اشاریہ ترجمان القرآن(۱۹۳۲ تا ۱۹۷۶) مرتبہ حکیم نعیم الدین زبیری، کراچی: ادارہ معارف اسلامی، ۱۹۸۵، ۴۴۳ص۔

*۶۳۔ ترجمان القرآن(لاہور)، اشاریہ ماہنامہ ترجمان القرآن(۲۰۰۸۔۲۰۰۹) مرتبہ شاہد حنیف۔ ص ۱۶، ۱۵

۶۴۔ تمثیل نو(دربھنگہ)، تمثیل نو(دربھنگہ) کا اشاریہ مرتبہ شاہد اقبال۔ مشمولہ تمثیل نو: ادبی صحافت کا نقش مرتبہ ابرار احمد اجراوی۔ دربھنگہ: الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، ۲۰۱۷،ص ۳۴۵

*۶۵۔ تہذیب الاخلاق(علی گڑھ)، اشاریہ مندرجات تہذیب الاخلاق(۱۸۷۰ تا ۱۸۹۷) مرتبہ محمد ضیاء الدین انصاری، علی گڑھ: مولانا آزاد لائبریری، ۱۹۸۷، ۴۶ص۔

۶۶۔ تہذیب الاخلاق(علی گڑھ)، تہذیب الاخلاق کا توضیحی اشاریہ(۱۸۷۰ تا ۱۸۷۶) مرتبہ

آفتاب عالم،علی گڑھ:علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،۱۹۹۱،۱۰۲ص۔(مقالہ ایم۔فل غیر مطبوعہ)

*۶۷۔ جامعہ(نئی دہلی)،جامعہ ملیہ اسلامیہ کا جامعہ(عہد اول(۱۹۲۳تا۱۹۴۷)کا اشاریہ مرتبہ شعائراللہ خاں رامپوری،پٹنہ:خدابخش لائبریری،۱۹۹۵،۹۲ص۔

۶۸۔ جامعہ(نئی دہلی)،فہرست وتلخیص مضامین رسالہ جامعہ(دہلی)(جنوری ۱۹۲۸ تا دسمبر ۱۹۳۶) مرتبہ پروین اختر،لاہور:یونیورسٹی اورینٹل کالج،۱۹۶۵،(مقالہ ایم۔اے غیر مطبوعہ)

۶۹۔ جامعہ(نئی دہلی)،فہرست وتلخیص مضامین رسالہ جامعہ(دہلی)(جنوری ۱۹۳۷تا جون ۱۹۴۷) مرتبہ خالدہ ادیب خانم،لاہور:یونیورسٹی اورینٹل کالج،۱۹۶۵،(مقالہ ایم۔اے غیر مطبوعہ)

۷۰۔ جامعہ(نئی دہلی)،تازہ خواہی داشتن اشاریہ ماہنامہ جامعہ(۱۹۹۲ تا ۱۹۹۳) مرتبہ جبیں انجم، جامعہ(نئی دہلی)جنوری ۱۹۹۴

۷۱۔ جامعہ(نئی دہلی)،رسالہ جامعہ کا تنقیدی اشاریہ(۱۹۲۳ تا ۱۹۴۷) مرتبہ فرزانہ خلیل،نئی دہلی:جامعہ ملیہ اسلامیہ(مقالہ پی ایچ ڈی غیر مطبوعہ)

*۷۲۔ جامعہ(نئی دہلی)،اشاریہ رسالہ جامعہ (۱۹۲۳۔۱۹۴۷، ۱۹۶۰۔۲۰۰۸) مترتبہ شہاب الدین انصاری۔مشمولہ''انتخاب رسالہ جامعہ جلد پنجم،نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ،۲۰۱۲، ۶۳۶ص

۷۳۔ جامعہ(نئی دہلی)،رسالہ جامعہ کا تنقیدی اشاریہ مرتبہ سبیلہ خاتون،نئی دہلی:جامعہ ملیہ اسلامیہ(مقالہ پی ایچ ڈی غیر مطبوعہ)

۷۴۔ جدید اردو(کلکتہ)،اشاریہ جدید اردو(۱۹۳۸ تا ۱۹۹۰) مرتبہ محمد ظفیر الحسن،آگہی(کراچی) مارچ۔اپریل ۱۹۹۱۔مئی ۱۹۹۲

۷۵۔ جوہر(نئی دہلی)،جوہر(نئی دہلی) جامعہ جوبلی نمبر ۱۹۴۶ مرتبہ نظر برنی۔اردو بک ریویو(نئی دہلی)نومبر۔دسمبر ۱۹۹۹،ص۴۳

۷۶۔ جوہر(نئی دہلی)،جوہر(نئی دہلی) ۱۹۴۰ کا اشاریہ مرتبہ نظر برنی۔اردو بک ریویو(نئی دہلی) جولائی۔اگست ۱۹۹۹،ص۴۳

۷۷۔ جہان اردو(دربھنگہ)،موضوعاتی فہرست سہ ماہی جہان اردو(جنوری۔دسمبر ۲۰۰۱) مرتبہ محمد نظر

عالم۔اردو بک ریویو(نئی دہلی)جولائی۔اگست۲۰۰۲،ص۱۹

*۷۸۔ جہان حمد،اشاریہ جہان حمد(جون ۱۹۹۸۔۲۰۱۱)مرتبہ محمد سہیل شفیق۔کراچی: جہان حمد پبلی کیشنز،۲۰۱۲،ص۳۵۲

۷۹۔ جہان طب(نئی دہلی)،اشاریہ سہ ماہی جہان طب(جون ۱۹۹۹۔جون۲۰۱۰)مرتبہ حکیم وسیم احمد اعظمی۔جہان طب(نئی دہلی)اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۱، جولائی۔دسمبر ۲۰۰۳،جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۷،جولائی۔ستمبر۲۰۰۹،اکتوبر۔دسمبر۲۰۱۰،

۸۰۔ حسن اور حسن کار،رسالہ حسن اور حسن کار کا وضاحتی اشاریہ مرتبہ شاہین۔حیدرآباد: حیدرآباد یونیورسٹی،۲۰۰۹ء(مقالہ پی۔ایچ ڈی)

۸۱۔ حکمت قرآن،ماہنامہ حکمت قرآن کے چند موضوعات کا اشاریہ(۲۰۰۰۔۲۰۰۳)مرتبہ محمد یونس جنجوعہ۔اردو بک ریویو(نئی دہلی)مارچ۔اپریل۲۰۰۲،ص۲۳،مئی۔جون۲۰۰۴،ص۲۳

۸۲۔ خبر نامہ:آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ(نئی دہلی)،سہ ماہی خبر نامہ کی چار جلدیں(۲۰۰۶۔ ۲۰۰۹):ایک جھلک۔مرتبہ محمد وقارالدین لطیفی ندوی۔ سہ ماہی خبر نامہ(نئی دہلی) اکتوبر ۲۰۰۹۔مارچ۲۰۱۰،ص۸۴

*۸۳۔ خدابخش لائبریری جرنل(پٹنہ)،خدابخش لائبریری جرنل(پٹنہ)شمارہ ۱تا۱۰۰(۱۹۷۷تا ۱۹۹۵) کے مضامین کی فہرست مرتبہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ: خدا بخش لائبریری،۱۹۹۶، ۵۵ص۔خدابخش لائبریری جرنل(پٹنہ)شمارہ نمبر۱۰۲،۱۹۹۵،ص۴۴۶

*۸۴۔ خدابخش لائبریری جرنل(پٹنہ)،خدابخش لائبریری جرنل(پٹنہ)شمارہ ۱۰۱تا۵۰ مرتبہ خدا بخش لائبریری،پٹنہ:خدابخش لائبریری،۲۰۰۹،ص۱۸

۸۵۔ خدابخش لائبریری جرنل(پٹنہ)،اشاریہ خدابخش لائبریری جرنل(۲۰۰۱)مرتبہ عارف اقبال۔ اردو بک ریویو(نئی دہلی)ستمبر۔دسمبر۲۰۰۲،ص۴۷

۸۶۔ دانش(اسلام آباد)،فہرست مقالات کہ در دانش چاپ شدہ(شمارہ ۱ تا ۳۷)مرتبہ رایزن فرہنگی جمہوری اسلامی ایران،دانش(اسلام آباد)شمارہ۸۳۔۳۹

۸۷۔ دانش(اسلام آباد)،فہرست موضوعی مقالات علمی فصل نامہ دانش درسی سال(۱۹۸۵۔۲۰۱۵،شمارہ

ا۔۱۱۹))مرتبہ سید مرتضیٰ موسوی وشگفتہ یسین عباسی، دانش (اسلام آباد) شمارہ ۱۲۱،ص ۲۲۶

۸۸۔ دبدبہ آصفی، رسالہ دبدبہ آصفی کا اشاریہ مرتبہ محمد عبدالرؤف۔حیدرآباد: حیدرآباد یونیورسٹی، ۲۰۰۸ (مقالہ ایم۔فل)

۸۹۔ دستاویز (کلکتہ)، شعبہ اردو کلکتہ یونیورسٹی کے ادبی اور تحقیقی مجلّے ''دستاویز'' کا موضوعاتی اشاریہ (۱۹۷۴۔۲۰۱۴) مرتبہ امتیاز وحید۔روح ادب (کولکتا) جولائی۔ستمبر ۲۰۱۸،ص ۵

*۹۰۔ دلگداز (لکھنؤ)، دلگداز کا اشاریہ (۱۸۸۷تا۱۹۱۸) مرتبہ محمد قمر سلیم ممبئی، ۲۰۰۳، ۲۴۰ص۔

۹۱۔ ذہن جدید (نئی دہلی)، ذہن جدید (نئی دہلی) کے پچاس شماروں میں شائع تحریروں کا تفصیلی پہرست سازی مرتبہ ادارہ۔ ذہن جدید (نئی دہلی) دسمبر ۲۰۰۷۔فروری ۲۰۰۸، جلد ۱۷ شمارہ ۵۰،ص ۱۹۵

*۹۲۔ راوی (لاہور)، اشاریہ راوی (دسمبر ۱۹۴۷ تا نومبر ۱۹۸۷) مرتبہ خواجہ خورشید احمد، لاہور: منیب بک ڈپو، مارچ ۱۹۸۹، ۲۱۴ص۔

۹۳۔ رثائی ادب (کراچی)، اشاریہ رثائی ادب (۱۹۹۶) مرتبہ مہر النسا عزیز، رثائی ادب (کراچی) جنوری۔مارچ ۱۹۹۷،ص ۶۵۔

۹۴۔ رحیق (لاہور)، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور ان کا ماہنامہ رحیق (اکتوبر ۱۹۵۶۔جولائی ۱۹۵۹) مرتبہ سفیر اختر۔واہ کینٹ: دارالمعارف، ۲۰۰۴، ۵۶ص

۹۵۔ الرحیم (حیدرآباد، سندھ)، اشاریہ ماہنامہ الرحیمجون ۱۹۶۳۔اکتوبر ۱۹۶۹ مرتبہ سفیر اختر۔واہ کینٹ: دارالمعارف، ۲۰۰۴، ۷۶ص

۹۶۔ الرشاد (اعظم گڑھ)، اشاریہ ماہنامہ الرشاد (۱۹۸۱۔۲۰۰۲) مرتبہ محمد الیاس اعظمی۔اعظم گڑھ: ندوۃ التالیف وترجمہ، ۲۰۰۴، ۲۳۲ص

۹۷۔ روح ادب (کلکتہ)، اشاریہ روح ادب (۱۹۸۴۔ ۲۰۰۹) مرتبہ فیروز احمد (مخزونہ خدا بخش لائبریری، غیر مطبوعہ)

۹۸۔ روشن (بدایوں)، اشاریہ رسالہ روشن (۱۹۸۳۔۱۹۹۰) مرتبہ سید آفتاب علی۔ اردو بک ریویو (نئی دہلی) ستمبر۔دسمبر ۲۰۰۲، ص ۴۳، جنوری۔فروری ۲۰۰۳، ص ۱۵، جولائی۔اگست

۲۰۰۳ص ۳۵

*۹۹۔ رہبر دکن (حیدرآباد)،فہرست عنوانات بابت ۱۹۴۴ تا ۱۹۴۷: اشاریہ رہبر دکن مرتبہ عبدالرحمٰن، حیدرآباد: انسٹی ٹیوٹ آف سوشل ریسرچ، ۱۹۷۹، ۵۸۵ص۔

*۱۰۰۔ زبان (منگرول)، رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت: ماہنامہ زبان (۱۹۲۶ تا ۱۹۲۸) مرتبہ خدابخش لائبریری، پٹنہ: خدابخش لائبریری، ۱۹۸۷، ۹۰۸ص۔

۱۰۲۔ زبان وادب (پٹنہ)، اشاریہ زبان وادب (اپریل ۱۹۷۷ تا اکتوبر ۱۹۹۰) مرتبہ حسیب الرحمٰن (مخزونہ خدابخش لائبریری، پٹنہ، غیر مطبوعہ)

*۱۰۳۔ زمانہ (کانپور)، زمانہ (جون ۱۹۰۳ تا دسمبر ۱۹۴۲) کے مشتملات کی فہرست۔ مرتبہ خدابخش لائبریری، پٹنہ: خدابخش لائبریری، ۱۹۹۵، ۳۵۲ص۔

*۱۰۴ زمانہ (کانپور)، رسالہ زمانہ کی ادبی خدمات مرتبہ شفیع احمد عثمانی۔ لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۲۰۰۹، ص ۷۹ (کتاب کا تیسرا باب زمانہ کا موضوع وار اشاریہ)

*۱۰۵۔ زمیندار (لاہور)، روزنامہ زمیندار اور تحریک آزادی (۱۹۱۳ تا ۱۹۴۰) کی فائلوں کا توضیحی اشاریہ، مرتبہ احمد سعید، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸، ۳۵۹ص۔

۱۰۶۔ زیب النساء، اردو ریسرچ سنٹر میں مخزونہ رسالہ زیب النساء کا اشاریہ مرتبہ ظفر آمنہ۔ حیدرآباد: حیدرآباد یونیورسٹی، ۲۰۰۶ (مقالہ ایم فل)

۱۰۷۔ زیب النساء، رسالہ زیب النساء کا وضاحتی اشاریہ مرتبہ ریشمہ خانم۔ حیدرآباد: حیدرآباد یونیورسٹی، ۲۰۰۷ (مقالہ ایم فل)

۱۰۸۔ ساقی (دہلی)، اشاریہ ساقی مرتبہ محمد ظفیر الحسن، آگہی (کراچی) جنوری ۱۹۹۳، ص ۷۳۔

۱۰۹۔ ساقی (دہلی)، رسالہ ساقی کا توضیحی اشاریہ (۱۹۳۰ تا ۱۹۴۰) مرتبہ زینت نہال، علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۲، ۷۴۸ص۔ (مقالہ ایم فل غیر مطبوعہ)

۱۱۰۔ ساقی (دہلی)، رسالہ ساقی کا وضاحتی اشاریہ مرتبہ سیدہ شہناز رضوی، حیدرآباد: یونیورسٹی آف حیدرآباد، ۲۰۰۶، (مقالہ ایم فل غیر مطبوعہ)

۱۱۱۔ سائنس (دہلی)، انڈکس ۱۹۹۵ رسالہ سائنس، مرتبہ انجمن فروغ سائنس، سائنس (دہلی) دسمبر

۱۹۹۵،ص۵۲۔

۱۱۲۔ سائنس(دہلی)،انڈکس۲۰۱۳رسالہ سائنس،مرتبہ فیروز دہلوی،سائنس(دہلی)دسمبر۲۰۱۲،ص۵۱۔

۱۱۳۔ سب رس(حیدرآباد)،اشاریہ ماہنامہ سب رس(۱۹۹۲ تا ۱۹۹۵) مرتبہ سید جلیل الدین، سب رس(حیدرآباد)جون۱۹۹۳، مارچ،اپریل۱۹۹۴، جولائی،ستمبر۱۹۹۵،فروری،مارچ، ۱۹۹۶،مئی،جون۱۹۹۸

۱۱۴۔ سب رس(حیدرآباد)،ماہنامہ سب رس کی مشروع کتابیات مرتبہ معین الدین۔حیدرآباد:یونیورسٹی آف حیدرآباد، ۲۰۰۶،(مقالہ ایم فل غیر مطبوعہ)حیدرآباد:عثمانیہ یونیورسٹی،۱۹۹۵،(مقالہ پی ایچ ڈی غیرمطبوعہ)

۱۱۵۔ سب رس(کراچی)،اشاریہ مضامین ماہنامہ سب رس(نومبر۱۹۷۷ تا دسمبر۱۹۸۹)مرتبہ عرشیہ رضوی،سب رس(کراچی)جون۔ستمبر۱۹۹۰،ص۱۔

۱۱۶۔ سب رس(کراچی)،رسالہ سب رس کا اشاریہ مرتبہ شمیم بانو قریشی،حیدرآباد:یونیورسٹی آف حیدرآباد(مقالہ ایم فل غیرمطبوعہ)

*۱۱۷۔ سچ(لکھنؤ)،ہفتہ وار سچ کا توضیحی اشاریہ مرتبہ عبدالعلیم قدوائی، پٹنہ: خدا بخش لائبریری،۲۰۰۰،۵۹۰ص۔

*۱۱۸۔ سوغات(بنگلور)،محمود ایاز کے سوغات کا اشاریہ مرتبہ سلمان عابد، پٹنہ: خدابخش لائبریری، ۱۹۹۵،۳۴ص۔

*۱۱۹۔ سیّارہ(لاہور)،وضاحتی فہرست رسالہ سیّارہ(اگست ۱۹۶۲ تا فروری ۱۹۷۲) مرتبہ رضیہ سلطانہ،لاہور:پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج،۱۹۸۷(مقالہ ایم۔اے غیرمطبوعہ)

۱۲۰۔ السیرۃ عالمی(کراچی)،اشاریہ مضامین شش ماہی السیرۃ عالمی(شمارہ ۱۔۵) مرتبہ احمد معاویہ۔السیرۃ عالمی(کراچی)مئی۲۰۰۱،ص۳۹۴،اردو بک ریویو(نئی دہلی)مئی۔جون ۲۰۰۲،ص۵۹

۱۲۱۔ السیرۃ عالمی(کراچی)،وضاحتی اشاریہ ششماہی السیرۃ عالمی(شمارہ۱۔۹)مرتبہ سید محمد اظہر سعید۔اردو بک ریویو(نئی دہلی)ستمبر۔اکتوبر۲۰۰۵،ص۱۷،نومبر۔دسمبر۲۰۰۵،ص۴۵

*۱۲۲۔ السیر ۃ عالمی (کراچی)،اشاریہ السیر ۃ عالمی (شمارہ ۱۔۲۵) مرتبہ محمد سعید شیخ۔کراچی: زوار اکیڈمی پبلی کیشنز،۱۴۴ص

۱۲۳۔ شاہراہ (دہلی)،شاہراہ کا توضیحی اشاریہ (۱۹۴۹ تا ستمبر ۱۹۶۰) مرتبہ پروین جہاں،علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،۱۹۸۸ (مقالہ ایم فل غیر مطبوعہ)

۱۲۴۔ شب خوں (الہ آباد)،رسالہ شب خوں کا تجزیاتی و وضاحتی اشاریہ مرتبہ عشرت فاطمہ سروری، حیدرآباد: یونیورسٹی آف حیدرآباد،(مقالہ ایم فل غیر مطبوعہ)

۱۲۵۔ شب خوں (الہ آباد) شب خوں کا توضیحی اشاریہ (جون ۱۹۶۶۔جون ۲۰۰۵) مرتبہ انیس صدیقی،نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۱۸۔جلد اول۔دوم،۷۱۵،۶۵۹ص۔

۱۲۶۔ الشریعۃ (گجرانوالہ)،اشاریہ ماہنامہ الشریعۃ (جلد ۵۔۶) مرتبہ عبید الرحمٰن ضیا، الشریعۃ (گجرانوالہ) دسمبر ۱۹۹۴۔دسمبر ۱۹۹۵

۱۲۷۔ صبح نو (پورنیہ/پٹنہ)،اشاریہ صبح نو (۱۹۵۲۔۱۹۵۴، ۱۹۵۸۔۱۹۷۶) مرتبہ ترنم جہاں۔(مخزونہ خدابخش لائبریری،پٹنہ،غیر مطبوعہ)

۱۲۸۔ صحیفہ (لاہور)،اشاریہ مقالات صحیفہ (شمارہ نمبر ۱۔۳۸) مرتبہ ملک احمد نواز،صحیفہ (لاہور) اپریل ۱۹۶۷ص ۷۶،جنوری ۱۹۷۱ص ۱۵۴،

۱۲۹۔ صحیفہ (لاہور)،اشاریہ صحیفہ (لاہور) جون ۱۹۵۸ تا اپریل ۱۹۷۸) مرتبہ محمد عبداللہ، جامعہ (نئی دہلی) جنوری۔جون ۱۹۸۳

۱۳۰۔ صحیفہ (لاہور)،اشاریہ صحیفہ (۱۹۵۷ تا اپریل ۱۹۹۰) مرتبہ نثار احمد فیضی (مخزونہ خدا بخش لائبریری،پٹنہ،غیر مطبوعہ)

۱۳۱۔ صدائے ملّت (اسلام آباد)،اشاریہ صدائے ملّت ،۱۴/فروری ۱۹۶۵ کے مشتملات۔مرتبہ احمد خاں،مشمولہ ''فکر ونظر کے پندرہ سال: ایک تفصیلی اشاریہ''۔اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی،۱۹۷۹،ص ۲۵۵

*۱۳۲۔ صدق (لکھنؤ)،مولانا عبدالماجد دریابادی کے ہفتہ وار کا توضیحی اشاریہ مرتبہ عبدالعلیم قدوائی۔پٹنہ: خدابخش لائبریری،۲۰۰۳،۷۰۰ص۔

۱۳۳۔ صدق جدید (لکھنؤ)، وضاحتی فہرست ہفت روزہ صدق جدید (۱۹۵۰ تا ۱۹۶۰)۔ مرتبہ فردوس اختر، لاہور: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۱۹۸۷ (مقالہ ام۔اے، غیر مطبوعہ)

۱۳۴۔ صدق جدید (لکھنؤ)، مولانا عبدالماجد دریابادی کے ہفتہ وار صدق جدید کا توضیحی اشاریہ مرتبہ عبدالعلیم قدوائی۔ پٹنہ: خدابخش لائبریری، ۲۰۱۳، ۶۶۶ ص۔

*۱۳۵۔ ضیائے حرم (لاہور)، اشاریہ ضیائے حرم (اکتوبر ۱۹۷۰ تا ستمبر ۱۹۹۰)۔ مرتبہ عابد حسین شاہ۔ چکوال: بہاءالدین زکریا لائبریری، ۱۹۹۷، ۳۳۲ ص۔

*۱۳۶۔ ضیائے وجیہ (رامپور)، اشاریہ ضیائے وجیہ (۱۹۹۰ تا ۲۰۰۰) شعائر اللہ خاں، رامپور: مکتبہ وزیریہ، ۲۰۰۱، ۱۲۰ ص۔

۱۳۷۔ عالم اسلام اور عیسائیت (اسلام آباد)، اشاریہ عالم اسلام اور عیسائیت مرتبہ ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، عالم اسلام اور عیسائیت (اسلام آباد) دسمبر ۱۹۹۳، دسمبر ۱۹۹۵، دسمبر ۱۹۹۶

*۱۳۸۔ العصر (لکھنؤ)، رسائل کے دفیوں سے اردو ادب کی بازیافت: العصر (۱۹۱۳ تا ۱۹۱۷) مرتبہ عابد رضا بیدار، پٹنہ: خدابخش لائبریری ۱۹۸۰، ۹۵۳ ص۔

۱۳۹۔ عصری ادب (نئی دہلی)، سہ ماہی عصری ادب (۱۹۷۰ تا ۱۹۸۸) مرتبہ عطا خورشید، معیار و تحقیق (پٹنہ) شمارہ نمبر ۱، ۱۹۸۹، ص ۵۲۵

۱۴۰۔ عصت (کراچی)، مضمون نگاران عصمت (جون ۱۹۰۸ تا جون ۱۹۶۸) مرتبہ ادارہ، عصمت (کراچی) اگست، ستمبر ۱۹۶۸، ص ۷۳

۱۴۱۔ العلم (کراچی)، اشاریہ مضامین العلم سہ ماہی (۱۹۵۱ تا ۱۹۷۳) مرتبہ حکیم نعیم الدین زبیری، العلم (کراچی) اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۷۳ ص ۷۷

۱۴۲۔ علوم القرآن (علی گڑھ)، ششماہی علوم القرآن کے آٹھ سال مرتبہ ظفر الاسلام اصلاحی۔ علوم القرآن (علی گڑھ) جولائی۔ دسمبر ۱۹۹۳

۱۴۳۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (علی گڑھ)، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا توضیحی اشاریہ مع مقدمہ (۱۸۸۱ تا ۱۸۸۵) مرتبہ محمد طاہر۔ علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۵، (مقالہ ایم۔فل غیر مطبوعہ)

۱۴۴۔ علی گڑھ میگزین (علی گڑھ)،علی گڑھ میگزین کا توضیحی اشاریہ مع مقدمہ (۱۹۲۰تا۱۹۶۰) مرتبہ سلطان احمد۔علی گڑھ:علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،۱۹۹۲،۲۹۷ص (مقالہ ایم۔فل غیر مطبوعہ)

*۱۴۵۔ غالب نامہ (نئی دہلی)،توضیحی اشاریہ غالب نامہ (ابتدا سے جولائی ۱۹۹۳) مرتبہ فاروق انصاری۔نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ،۱۹۹۵،۱۲۸ص

۱۴۶۔ فاران (کراچی)،اشاریہ فاران مرتبہ صفدر علی خاں۔انشا (حیدرآباد) شمارہ ۱۸۔۱۹،ص ۱۲۹

۱۴۷۔ الفاروق (کراچی)،اشاریہ الفاروق مرتبہ جامعہ فاروقیہ،کراچی۔الفاروق (کراچی) ذوالحجہ ۱۴۱۸ھ،ص ۵۹

۱۴۸۔ فکر وتحقیق (نئی دہلی)،فکر وتحقیق کی اشاریہ سازی مرتبہ ظفر عبداللہ وانی۔حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مقالہ پی ایچ ڈی)

۱۴۹۔ فکر وتحقیق (نئی دہلی)،فکر وتحقیق کا توضیحی اشاریہ (جنوری۔جون ۱۹۸۹) مرتبہ ارشاد قمر۔اردو دنیا (نئی دہلی) مئی ۲۰۱۷،ص ۶۴

*۱۵۰۔ فکر ونظر (اسلام آباد)،فکر ونظر کے پندرہ سال (جولائی ۱۹۶۳ تا جون ۱۹۷۸) ایک تفصیلی اشاریہ مرتبہ احمد خاں۔اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی،۱۹۷۹،۲۵۶ص

*۱۵۱۔ فکر ونظر (اسلام آباد)،اشاریہ فکر ونظر (جولائی ۱۹۷۸ تا جون ۱۹۹۳) مرتبہ شیر نوروز خاں۔اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی،۲۰۰۱،۱۹۹ص

۱۵۲۔ فکر ونظر (اسلام آباد)،فکر ونظر (اسلام آباد) کے خصوصی شمارے مرتبہ اعجاز احمد۔فکر و نظر (اسلام آباد) جنوری۔مارچ ۲۰۰۸،ص ۱۵۳

۱۵۳۔ فکر ونظر (علی گڑھ)،اشاریہ فکر ونظر (۱۹۶۰۔۱۹۸۴، ۲۰۰۲۔۲۰۱۶) مرتبہ محمد بکر عالم صدیقی۔فکر ونظر (علی گڑھ) جون ۲۰۱۴،ص ۱۳۵،ستمبر ۲۰۱۴،ص ۱۳۵،جلد ۵۱ شمارہ ۴، ۲۰۱۴،جلد ۵۳ شمارہ ۱۔۴،۲۰۱۶

۱۵۴۔ فکر ونظر (علی گڑھ)،سہ ماہی فکر ونظر کا اشاریہ (۱۹۶۰ تا ۱۹۹۰) مرتبہ محمد ضیاء الدین انصاری۔خدا بخش لائبریری جرنل (پٹنہ) شمارہ نمبر ۷۸۔۸۰،۱۹۹۲،ص ۲۹۸

۱۵۵۔ قوس (حمزہ پور)،اشاریہ ماہنامہ قوس (۱۹۸۴۔ ۱۹۸۶) مرتبہ عطا عابدی۔ہماری

زبان (نئی دہلی) ۸/اپریل ۲۰۰۹، ص ۲

۱۵۶۔ قومی زبان (کراچی)، اشاریہ قومی زبان (اکتوبر ۱۹۶۳۔دسمبر ۱۹۹۸) مرتبہ نثار احمد فیضی (مخزونہ خدابخش لائبریری، غیر مطبوعہ)

۱۵۷۔ کتاب (لاہور)، اشاریہ ماہنامہ کتاب (۱۹۸۳ تا ۱۹۸۵) مرتبہ نیشنل بک فاؤنڈیشن آف پاکستان۔ کتاب (لاہور) مارچ ۱۹۸۴، جنوری ۱۹۸۵، جنوری ۱۹۸۶

۱۵۸۔ کتاب (لاہور)، اشاریہ مضامین ماہنامہ کتاب (۱۹۷۹) مرتبہ میاں نذیر احمد۔ کتاب (لاہور) دسمبر ۱۹۷۹

۱۵۹۔ کتاب نما (نئی دہلی)، کتاب نما (نئی دہلی) کا وضاحتی اشاریہ مرتبہ فرزانہ بیگم۔ حیدرآباد: حیدرآباد یونیورسٹی، ۲۰۰۵ (مقالہ ایم فل، غیر مطبوعہ)

۱۶۰۔ کنزالایمان (دہلی)، ماہنامہ کنزالایمان کا سالانہ موضوعاتی اشاریہ (۱۹۹۸۔۲۰۰۷) مرتبہ محمد صابر رضا رہبر مصباحی/محمد ظفرالدین برکاتی۔ کنزالایمان (دہلی) اپریل ۲۰۰۸، ص ۹

۱۶۱۔ کنزالایمان (دہلی)، ماہنامہ کنزالایمان کا سالانہ موضوعاتی اشاریہ (۲۰۰۸۔۲۰۱۰) مرتبہ محمد ظفرالدین برکاتی۔ کنزالایمان (دہلی) جنوری ۲۰۰۸، ص ۴۴، فروری ۲۰۰۸، ص ۴۰، فروری ۲۰۰۹، ص ۳۸، جنوری ۲۰۱۰، ص ۴۷، جنوری ۲۰۱۱، ص ۵۲

۱۶۲۔ گگن (بمبئی)، گگن نما: ماہنامہ گگن) بمبئی) مع اُفق تا افق، علی گڑھ) کے بائس برسوں کے پرچوں کا مکمل اشاریہ (۱۹۶۳ت۔۱۹۸۴، ۱۹۸۶، ۱۹۹۴۔۱۹۹۵) مرتبہ اسیم کاویانی۔ مشمولہ انتخاب گگن: جلد دوم مرتبہ اسیم کاویانی، بمبئی: کاویانی پبلیشرز، ۲۰۰۹، ص ۱۱۲۶

۱۶۳۔ ماہ نو (کراچی)، اشاریہ مضامین ماہ نو (اپریل ۱۹۴۸ تا دسمبر ۱۹۶۸) مرتبہ ادارہ مطبوعات پاکستان۔ ماہ نو (کراچی) اگست ۱۹۶۹، ص ۶۹

۱۶۴۔ مجلّہ بدایوں (کراچی)، اشاریہ مجلّہ بدایوں (فروری ۱۹۹۱ تا دسمبر ۱۹۹۵) مرتبہ ابراہیم خلیل نقوی سہسوانی۔ مجلّہ بدایوں (کراچی) اگست۔ اکتوبر ۱۹۹۶، دسمبر ۱۹۹۶، جنوری، مئی ۱۹۹۷

۱۶۵۔ مجلّہ عثمانیہ (حیدرآباد)، اشاریہ مجلّہ عثمانیہ (۱۹۲۷۔۱۹۸۸) مرتبہ محمد عطاء اللہ خاں۔ حیدرآباد: حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، ۱۹۸۸، (مقالہ ایم فل، غیر مطبوعہ)

۱۶۶۔ مجلّہ علوم اسلامیہ (علی گڑھ)، فہارس مجلّہ علوم اسلامیہ (۱۹۶۰ تا ۱۹۶۹) مرتبہ اکمل ایوبی۔ مجلّہ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جون۔ دسمبر ۱۹۶۹

۱۶۷۔ المجیب (پھلواری شریف)، اشاریہ المجیب مرتبہ محمد سراج الاسلام (مخزونہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ، غیر مطبوعہ)

۱۶۸۔ مخزن (لاہور)، مخزن کا توضیحی ماشاریہ مرتبہ جاوید اختر۔ علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۰، ۳۴۵ص۔ (مقالہ ایم فل غیر مطبوعہ)

*۱۶۹۔ مخزن (لاہور)، ماہنامہ مخزن (لاہور) اشاریہ اور ادبی خدمات مرتبہ امتیاز ندیم۔ مؤناتھ بھنجن: مرتب، ۲۰۰۷، ۴۹۶ص

۱۷۰۔ مخزن (لاہور)، رسالہ مخزن کا وضاحتی اشاریہ مرتبہ شیخ عائشہ۔ حیدرآباد: حیدرآباد یونیورسٹی، ۲۰۰۹، (مقالہ ایم فل غیر مطبوعہ)

۱۷۱۔ مخزن (لاہور)، اشاریہ مخزن دور پنجم (شمارہ ۱۔۲۴، جنوری ۲۰۰۱۔ دسمبر ۲۰۱۲) مرتبہ محمد ہارون عثمانی۔ مخزن (لاہور) دور جدید شمارہ ۲۷، ۲۰۱۴، ص ۲۱۶

۱۷۲۔ مرغزار (شیخوپورہ، پاکستان)، اشاریہ مرغزار حصہ اردو (جنوری ۱۹۶۴ تا ۱۹۹۲) مرتبہ سید فخر حسین بخاری۔ مرغزار (شیخوپورہ) جلد ۱۷ شمارہ ۱۹، ص ۱۲۲

۱۷۳۔ مریخ (پٹنہ)، اشاریہ مریخ (۱۹۶۸ تا حال) مرتبہ محمد حبیب الرحمٰن علیگ۔ مریخ (پٹنہ) مئی۔ ستمبر ۲۰۰۱، ص ۳۸

۱۷۴۔ معارف (اعظم گڑھ)، معارف کی وضاحتی فہرست (جولائی ۱۹۱۶ تا دسمبر ۱۹۲۸) مرتبہ عزیز شمیم اختر۔ لاہور: یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۱۹۶۶ (مقالہ ایم فل غیر مطبوعہ)

*۱۷۵۔ معارف (اعظم گڑھ)، علوم اسلامیہ کا انسائکلو پیڈیا: پہلی جلد ماہنامہ معارف کا اشاریہ (۱۹۱۶ تا ۱۹۷۰) مرتبہ عابد رضا بیدار و شائستہ خاں۔ دہلی، ۱۹۹۵، ۳۱۷ص

*۱۷۶۔ معارف (اعظم گڑھ)، اشاریہ معارف (جولائی ۱۹۱۶۔ جون ۲۰۰۵) مرتبہ محمد سہیل شفیق۔ کراچی: قرطاس، ۲۰۰۶، ۶۴۲ص

۱۷۷۔ معارف (اعظم گڑھ)، رسالہ معارف کا اشاریہ (ابتدا سے ۱۹۴۷ء) مرتبہ محمد یوسف

علی۔حیدرآباد: حیدرآباد یونیورسٹی،۲۰۰۵،(مقالہ ایم فل غیر مطبوعہ)

۱۷۸۔ معارف (اعظم گڑھ)،اشاریہ مضامین معارف (۱۹۱۶ تا ۱۹۳۵) مرتبہ صابرہ بیگم۔اردو ادب (نئی دہلی) شمارہ۳، ۱۹۸۳،شمارہ۱ ۱۹۸۷

۱۷۹۔ معارف (اعظم گڑھ)،معارف کا توضیحی اشاریہ (۱۹۴۷ تا۱۹۷۲) مرتبہ شمیمہ خاتون۔علی گڑھ:علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،۱۹۹۴،۳۷۰ص (مقالہ ایم فل غیر مطبوعہ)

۱۸۰۔ معارف (اعظم گڑھ)،ماہنامہ معارف کے اشاریے مرتبہ جمشید احمد ندوی۔معارف (اعظم گڑھ) اپریل۔مئی ۱۹۹۹،ص ۲۹۷،۳۷۵

۱۸۱۔ معارف (اعظم گڑھ)،اشاریہ معارف (جولائی ۱۹۱۶۔دسمبر ۲۰۱۱) مرتبہ جمشید احمد ندوی۔اعظم گڑھ: دارالمصنفین،۲۰۱۲،۷۲۳ص

۱۸۲۔ معارف (اعظم گڑھ)،معارف (۱۹۱۶ تا ۱۹۳۰) میں قرآن حکیم پر مضامین کا جائزہ مرتبہ نسرین بیگم۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۱۹۷۳،(مقالہ ایم فل غیر مطبوعہ)

۱۸۳۔ المعارف (لاہور)،اشاریہ ماہنامہ المعارف (جنوری ۱۹۶۸ تا مئی ۱۹۷۸) مرتبہ محمد عبداللہ۔اسلام اور عصر جدید (نئی دہلی) جولائی،اکتوبر۱۹۸۳،اکتوبر۱۹۸۴،جنوری،اپریل۱۹۸۵

۱۸۴۔ المعارف (لاہور)،اشاریہ المعارف (جنوری ۱۹۶۸ تا مئی ۱۹۷۸،جنوری۔دسمبر۱۹۸۳) مرتبہ عبداللہ خاور۔اقبالیات (سری نگر) شمارہ۸جنوری۱۹۹۶،ص ۹۷

*۱۸۵۔ معارف رضا (کراچی)،اشاریہ سالنامہ معارف رضا (۱۹۸۱۔۲۰۰۶) مرتبہ سید صابر حسین شاہ بخاری قادری۔کراچی: ادارہ تحقیقات امام احمد رضا انٹرنیشنل،۲۰۰۸،۱۱۴ص

*۱۸۶۔ معاصر (پٹنہ)،کلیم الدین احمد اور قاضی عبدالودود کے رسالہ معاصر (۱۹۴۰ تا ۱۹۸۳) کا انتخاب (فہرست مشتملات) مرتبہ عطا خورشید۔پٹنہ: خدابخش لائبریری،۱۹۹۵،۵۷۵ص۔

*۱۸۷۔ معاصر (پٹنہ)،معاصر کا توضیحی اشاریہ مرتبہ محمد نور اسلام۔پٹنہ: خدا بخش لائبریری، ۲۰۰۲،۲۱۸ص

*۱۸۸۔ معیار (پٹنہ)،قاضی عبدالودود کا ۱۹۳۶ء کا معیار: ایک تجزیاتی اشاریے کے ساتھ مرتبہ عابد رضا بیدار۔پٹنہ: خدابخش لائبریری،۱۹۸۱،۴۰۰ص

۱۸۹۔ الموسی، رسالہ الموسی کا وضاحتی اشاریہ مرتبہ سعید بن محمد۔حیدرآباد: حیدرآباد یونیورسٹی، ۲۰۰۹، (مقالہ ایم فل غیر مطبوعہ)

۱۹۰۔ الناظر (لکھنؤ)، رسالہ الناظر کا توضیحی اشاریہ مع مقدمہ (۱۹۰۹ تا ۱۹۳۷) مرتبہ محمد قسیم اللہ۔علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۳، (مقالہ ایم فل غیر مطبوعہ)

۱۹۱۔ الناظر (لکھنؤ)، اشاریہ الناظر (جولائی ۱۹۰۹ تا نومبر ۱۹۳۷) مرتبہ امیر حسن نورانی (مخزونہ خدابخش لائبریری، غیر مطبوعہ)

۱۹۲۔ الندوہ (لکھنؤ)، الندوہ کا اشاریہ (۱۹۰۴ تا ۱۹۱۲) مرتبہ عابد رضا بیدار۔ادیب (علی گڑھ) ستمبر ۱۹۶۰ شبلی نمبر ص ۳۸۲

۱۹۳۔ ندیم (گیا)، اشاریہ ندیم (۱۹۳۱۔۱۹۴۹) مرتبہ محمد سراج الاسلام (مخزونہ خدابخش لائبریری، پٹنہ، غیر مطبوعہ)

۱۹۴۔ نعت رنگ (کراچی)، اشاریہ نعت رنگ (شمارہ ۱۔۳، ۱۹۹۵ ۔۱۹۹۶) مرتبہ مصباح العثمان۔نعت رنگ (کراچی) شمارہ ۴، ص ۳۲۱

*۱۹۵۔ نعت رنگ (کراچی)، اشاریہ نعت رنگ (شمارہ ۱۔۲۰) مرتبہ محمد سہیل شفیق۔کراچی: نعت ریسرچ سنٹر، ۲۰۰۹، ۲۶۷ص

۱۹۶۔ نقاد (آگرہ)، ماہنامہ نقاد اور اس کا اشاریہ (۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴) بہ سید باد عل۔قومی زبان (کراچی) مئی۔جون ۱۹۷۲

۱۹۷۔ نقد و نظر (علی گڑھ)، اشاریہ نقد و نظر (۱۹۷۹ تا ۱۹۹۶) مرتبہ سید مسعود حسن۔خدابخش بریری جرنل (پٹنہ) شمارہ ۱۱۳، ۱۹۹۸، ص ۲۲۹

۱۹۸۔ نقطہ نظر (اسلام آباد)، اشاریہ نقطہ نظر (شمارہ ۱۔۱۰) مرتبہ سفیر اختر۔نقطہ نظر (اسلام آباد) اپریل۔ستمبر ۲۰۰۱، ص ۱۰۶

۱۹۹۔ نقوش (لاہور)، اشاریہ نقوش (مارچ ۱۹۴۸ تا ستمبر ۱۹۸۶) مرتبہ سید جمیل احمد رضوی۔نقوش (لاہور) جولائی ۱۹۸۷ محمد طفیل نمبر، جلد دوم، ص ۸۸۴

۲۰۰۔ نقیب (بدایوں)، نقیب (بدایوں) تاریخ اور اشاریہ (فروری ۱۹۱۹۔ستمبر ۱۹۲۲) مرتبہ جاوید

اختر علی آبادی۔سہ ماہی اردو(کراچی)جنوری۔مارچ ۱۹۹۰،ص ۱۲۱

*۲۰۱۔ نگار(لکھنؤ)، نیاز فتحوری کا نگار: وضاحتی اشاریہ(۱۹۲۲تا۱۹۶۶)مرتبہ عطا خورشید۔پٹنہ: خدا بخش لائبریری،۱۹۹۴،۲۴۷ص

۲۰۲۔ نوائے ادب(بمبئی)،نوائے ادب کی نصف صدی کا اشاریہ مرتبہ سعد الرحمٰن۔حیدر آباد: یونیورسٹی آف حیدرآباد،۱۹۹۲،(مقالہ ایم۔فل،غیر مطبوعہ)

۲۰۳۔ نوائے ادب(بمبئی)،نوائے ادب کا اشاریہ(۱۹۵۱تا۱۹۶۹)مرتبہ رقیہ انعامدار۔نوائے ادب(بمبئی)اپریل ۱۹۷۰

*۲۰۴۔ نوائے وقت(لاہور)،اشاریہ نوائے وقت۴۴ تا ۱۹۴۷) مرتبہ سرفراز حسین مرزا۔لاہور: پاکستان اسٹڈی سنٹر پنجاب یونیورسٹی،۱۹۸۷،۶۶۰ص

۲۰۵۔ نیا دور(کراچی)،وضاحتی فہرست(مضامین)رسالہ نیا دور مرتبہ ادیب زہرا کاظمی۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج،۱۹۸۳،(مقالہ ایم فل(غیر مطبوعہ)

۲۰۶۔ نیا دور(کراچی)،نیا دور کا توضیحی اشاریہ مع مقدمہ(شمارہ ۱۔۸۲)مرتبہ رعنا کمال۔علی گڑھ :علی گڑھ مسلم یونورسٹی،۱۹۸۸،۲۴۹ص(مقالہ ایم فل(غیر مطبوعہ)

۲۰۷۔ نیا دور(کراچی)،اشاریہ نیا دور(شمارہ ۱۔۸۸)رتبہ نثار احمد فیضی۔پٹنہ: خدا بخش لائبریری، ۲۰۰۱،۲۱۰ص

*۲۰۸۔ نیا دور(کراچی)،اشاریہ سہ ماہی نیا در(۱۹۵۵تا۱۹۹۳)مرتبہ مصباح العثمان۔کراچی: بزم تخلیق ادب،۰۰۶،۲۲۷ص

۲۰۹۔ نیا دور(لکھنؤ)،کتابیات مضامین نیا دور(جنوری۔دسمبر۱۹۸۲) مرتبہ امام مرتضی نقوی۔ ہماری زبان(نئی دہلی) یکم اپریل۱۹۸۳،

۲۱۰۔ نیا دور(لکھنؤ)،اشاریہ نیا دور(۱۹۵۵۔۲۰۰۱) :حصہ اول۔دوم،مرتبہ محمد اطہر مسعود خاں۔ رامپور: رامپور رضا لائبریری،۲۰۰۹،۸۳۰،۸۳۴ص

*۲۱۱۔ نیرنگ خیال(لاہور)، نیرنگ خیال کا موضوعاتی اشاریہ(۱۹۲۴تا۱۹۴۷)مرتبہ دیوان حنان خاں۔نئی دہلی: مرتب،۲۰۰۷،۲۴۰ص

۲۱۲۔ وسطی ایشیا کے مسلمان (اسلام آباد)،اشاریہ وسطی ایشیا کے مسلمان (جلد اول۔پنجم،۱۹۹۲ تا۱۹۹۷) مرتبہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز،اسلام آباد وسطی ایشیا کے مسلمان (اسلام آباد) نومبر۔دسمبر۱۹۹۳،جنوری۔فروری،نومبر۔دسمبر۱۹۹۵،نومبر۔دسمبر۱۹۹۶،نومبر۔دسمبر ۱۹۹۷

۲۱۳۔ الہلال (کلکتہ)،الہلال اورالبلاغ کا توضیحی اشاریہ (۱۳/جولائی۱۹۱۲تا۹/دسمبر۱۹۲۷) مرتبہ سید حامد علی۔علی گڑھ:علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،۱۹۸۹،۴۴۸ص (مقالہ ایم۔فل غیر مطبوعہ)

۲۱۴۔ الہلال (کلکتہ)،الہلال کا انڈکس مرتبہ محمد عتیق صدیقی۔اردو ادب (نئی دہلی) شمارہ۲،۱۹۶۱،

۲۱۵۔ الہلال (کلکتہ)،ابوالکلام آزاد کا رسالہ الہلال کا اشاریہ مرتبہ سید مصطفیٰ۔حیدرآباد: حیدرآباد یونیورسٹی،۲۰۰۶،(مقالہ ایم۔فل غیر مطبوعہ)

۲۱۶۔ ہمارا ادب (سری نگر)،ہمارا ادب کا اشاریہ(۱۹۵۹ تا ۱۹۸۹) مرتبہ عبدالمجید بٹ جاجنی۔بازیافت (سری نگر) دسمبر۱۹۹۲ء

۲۱۷۔ ہمارا ادب (سری نگر)،ہمارا ادب کا اشاریہ مرتبہ عبدالمجید بٹ۔سرینگر:کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۹۱ء،(مقالہ ایم۔فل غیر مطبوعہ)

۲۱۸۔ ہماری زبان (نئی دہلی)،کتابیات مضامین ہماری زبان (یکم جنوری ۱۹۵۸ تا ۸/مئی۱۹۷۲) مرتبہ امام مرتضی نقوی۔ہماری زبان (نئی دہلی)۲۲/جنوری۔۸/مارچ۱۹۸۳

۲۱۹۔ ہماری زبان (نئی دہلی)،اشاریہ ہماری زبان (۱۹۸۸) مرتبہ حسن ضیاء۔ری زبان (نئی دہلی) یکم فروری۱۹۸۹ء

۲۲۰۔ ہماری زبان (نئی دہلی)،اشاریہ ہماری زبان (۱۹۹۰) مرتبہ صابر سنبھلی۔ہماری زبان (نئی دہلی)۲۲جنوری۔یکم فروری۱۹۹۱ء

۲۲۱۔ ہماری زبان (نئی دہلی)،اشاریہ ہماری زبان (۱۹۹۷۔۱۹۹۸) مرتبہ حشمت فاتحہ خوانی/مشتاق احمد۔ہماری زبان (نئی دہلی)۸/اپریل۱۹۹۸ء،ص۸،۸/فروری۱۹۹۹،ص۲

۲۲۲۔ ہماری زبان (نئی دہلی)،اشاریہ ہماری زبان (۱۹۹۹۔۲۰۰۰) مرتبہ مشتاق احمد۔ہماری زبان (نئی دہلی)۲۲/جنوری۲۰۰۰،ص۸،یکم فروری۲۰۰۰،ص۲،یکم،۸فروری۲۰۰۱،ص۲

۲۲۳۔ ہماری زبان (نئی دہلی)،اشاریہ ہماری زبان (۲۰۰۱۔۲۰۰۹) مرتبہ محمد عارف خاں۔ہماری زبان (نئی دہلی) یکم،۸رجنوری ۲۰۰۲،ص۸، یکم،۸،۱۵ جنوری ۲۰۰۳،ص ۸، یکم،۸،۱۵ جنوری ۲۰۰۴، ص۸، یکم،۸،۱۵ جنوری ۲۰۰۵، ص۸،اردو بک ریویو(نئی دہلی) مارچ۔اپریل ۲۰۰۵،ص۲۷، ہماری زبان (نئی دہلی) یکم،۸رجنوری ۲۰۰۶،ص۲، یکم،۸،۱۵ جنوری ۲۰۰۷،۱۵،۲۲ جنوری، یکم فروری ۲۰۰۸،۱۵ جنوری ۲۰۰۹،ص۸، یکم جنوری ۲۰۱۰،ص۲

۲۲۴۔ ہماری زبان (نئی دہلی)،اشاریہ ہماری زبان (۲۰۱۲۔۲۰۱۳) مرتبہ محمد عارف خاں۔ہماری زبان (نئی دہلی)۱۵،۲۲ فروری، یکم مارچ ۲۰۱۳ یکم،۸فروری ۲۰۱۴،

۲۲۵۔ ہماری زبان (نئی دہلی)،اشاریہ ہماری زبان (۲۰۱۸) مرتبہ محمد عارف خاں۔ہماری زبان (نئی دہلی)۱۵،۲۲ جنوری، یکم فروری ۲۰۱۹،

۲۲۶۔ ہماری زبان (نئی دہلی)،اشاریہ ہماری زبان مرتبہ ہما۔گورکھپور: دین دیال اپادھیائے گورکھپور یونیورسٹی (مقالہ پی ایچ ڈی جاری)

۲۲۷۔ ہمایوں (لاہور)،وضاحتی فہرست رسالہ ہمایوں (جنوری ۱۹۳۲۔دسمبر ۱۹۴۴) مرتبہ شائستہ عظمت۔لاہور:اورینٹل کالج (مقالہ ایم۔فل،غیر مطبوعہ)

۲۲۸۔ ہمایوں (لاہور)، رسالہ ہمایوں کی وضاحتی فہرست (جنوری ۱۹۴۵۔ ۱۹۵۷) مرتبہ بختیار بانو۔لاہور:اورینٹل کالج (مقالہ ایم۔فل غیر مطبوعہ)

۲۲۹۔ ہمایوں (لاہور)،اشاریہ ماہنامہ ہمایوں (۱۹۲۲۔۱۹۵۸) مرتبہ نسرین اختر۔اورینٹل کالج میگزین (لاہور) جلد ۵۹ شمارہ ۲۔۳،۱۹۸۵،ص۱۷۴

۲۳۰۔ ہمایوں (لاہور)،اشاریہ نثری نگارشات ہمایوں (۱۹۲۲۔۱۹۵۸) مرتبہ نسرین اختر ارشاد،۱۹۸۵ء (بحوالہ اورینٹل کالج کے موجودہ اساتذہ: کوائف وعلمی خدمات مرتبہ سفیع الدین ہاشمی، لاہور: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۱۹۹۷،ص۷۵

۲۳۱۔ ہمایوں (لاہور)،رسالہ ہمایوں کا توضیحی اشاریہ (ابتدا تا ۱۹۴۷ء تک) مرتبہ نگار شگفتہ جبیں۔علی گڑھ:علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،۱۹۹۲،۲۸۶ص (مقالہ ایم فل غیر مطبوعہ)

۲۳۲۔ ہمدرد (دہلی)،اشاریہ جات ہمدرد کا مرید مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری۔مشمولہ ''مولانا محمد علی

اوران کی خدمات مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری۔کراچی: ادارہ تصنیف وتحقیق پاکستان،۱۹۸۳، ص۲۹۵

۲۳۳۔ ہندستانی (الہ آباد)،رسالہ ہندستانی کا اشاریہ مرتبہ محمود عالم ہاشمی۔(مخزونہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ، غیر مطبوعہ)

۲۳۴۔ ہندستانی (الہ آباد)،رسالہ ہندستانی (وضاحتی فہرست) مرتبہ طاہرہ انور ملک۔ لاہور: یونیورسٹی اورینٹل کالج،۱۹۶۵ء (مقالہ ایم۔اے، غیر مطبوعہ)

۲۳۵۔ یوجنا (نئی دہلی)،اشاریہ ماہنامہ یوجنا (اردو) ۱۹۹۹ء۔مرتبہ عارف اقبال۔اردو بک ریویو (نئی دہلی) مئی۔جون ۲۰۰۰، ۴۷

۲۳۶۔ یوجنا (نئی دہلی)،اشاریہ ماہنامہ یوجنا (اردو) ۲۰۰۳۔۲۰۰۴ء۔مرتبہ عارف اقبال۔اردو بک ریویو (نئی دہلی) ستمبر۔اکتوبر ۲۰۰۴، ص۱۵، مئی۔جون ۲۰۰۵، ص۲۱

☆☆☆

فہرست اشاریہ نگاراں

آباد علی، سید۔۱۹۵
آفتاب عالم۔۶۶
آفتاب علی۔۹۸
ابوسلمان شاہجہانپوری۔۵۲،۵۳،۲۳۱،
احمد خان۔۱۳۱،۱۴۹،
احمد سعید۔۱۰۵
احمد معاویہ۔۱۲۰
اختر النساء۔۳۳،۳۷
اختر، عزیز شمیم۔۱۷۳
ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی۔۵۹
ادارہ مرکز الدراسات العلمیہ۔۷
ادارہ مطبوعات پاکستان۔۱۶۲
اسحاق علی، سید۔۶۱
اسلم کمال، محمد۔۸
اسیر، محمود احمد۔۳۸
اسیم کاویانی۔۱۶۱
اصلاحی، ذاکر حسین۔۱۸
اصلاحی، ظفر الاسلام۔۱۴۲
اطہر مسعود خاں، محمد۔۲۰۹
اعجاز احمد۔۱۵۱
اعظمی، سعید اختر۔۱۶،۱۷،۱۹،۲۰،
اعظمی، محمد الیاس۔۹۶
اعظمی، وسیم احمد۔۷۹
اکمل ایوبی۔۱۶۵
امتیاز ندیم۔۱۶۸
امتیاز وحید۔۸۹
انجمن فروغ سائنس۔۱۱۱
انیس صدیقی۔۱۲۵
ایوب، محمد رمضان۔۴۰
بخاری، سید صابر حسین شاہ۔۳۲
بخاری، سید فخر حسین۔۱۷۱
بختیار بانو۔۲۲۷
بدیع الزماں، محمد۔۵۱
برکاتی، محمد ظفر الدین۔۱۵۹،۱۶۰،
بشیر حسین، محمد۔۴۳
بھٹی، محمد ساجد۔۲۹
بیدار، عابد رضا۔۱۱،۴۶،۱۳۸،۱۷۴،
۱۸۷،۱۹۱
پروین اختر۔۶۸
پروین جہاں۔۱۲۳
ترنم جہاں۔۱۲۷
تسنیم فاطمہ۔۴۹
جاجنی، عبدالعزیز بٹ۔۲۱۵۔۲۱۶،
جامعہ فاروقیہ۔۱۴۸
جاوید اختر علی آبادی۔۱۹۹
جاوید اختر۔۱۶۷
جاوید اشرف۔۲۹،۳۵
جبیں انجم۔۷۰
جعفری، عقیل عباس۔۸
جلیل الدین، سید۔۱۱۳
جمشید احمد ندوی۔۱۷۹،۱۸۰،
جمیل اختر۔۱۔۲
جنجوعہ، محمد یونس۔۸۱
حامد علی، سید۔۴۸،۲۱۲،
حبیب الرحمٰن علیگ، محمد۔۱۷۲
حسن ضیاء۔۲۱۸
حسیب الرحمٰن۔۱۰۲
حشمت فاتحہ خوانی۔۲۲۰
حنان خاں، دیوان۔۲۱۰
خالدہ ادیب خانم۔۶۹
خاور، عبداللہ۔۱۸۳
خدا بخش لائبریری۔۸۳۔۸۴،۱۰۱،۱۰۳،
خورشید احمد، خواجہ۔۹۲
ذہن جدید۔۹۱
رایزن فرہنگی جمہوری اسلامی
ایران۔۸۶
رضوی، سید جمیل احمد۔۱۹۸
رضوی، سید سرفراز علی۔۱۲
رضیہ سلطانہ۔۱۱۹
رعنا کمال۔۲۰۵
رقیہ انعامدار۔۲۰۲
ریشمہ خانم۔۱۰۷
زبیری، نعیم الدین۔۶۲،۱۴۱،
زینت نہال۔۱۰۹
سہیلہ خاتون۔۷۳
سراج الاسلام، محمد۔۱۶۶،۱۹۲،
سرفراز حسین مرزا۔۲۰۳
سروری، عشرت فاطمہ۔۱۲۴
سعد الرحمٰن۔۲۰۱
سعید بن محمد۔۱۸۸
سعید شیخ، محمد۔۱۲۲
سعید، سید محمد اظہر۔۱۲۱
سفیر اختر۔۲۷،۹۴،۹۵،۱۹۷،
سلطان احمد۔۱۴۴

سلمان عابد۔۱۱۸
سید مصطفیٰ۔۲۱۴
شائستہ خاں۔۴۶
شائستہ عظمت۔۲۲۶
شاہد اقبال۔۶۴
شاہد حنیف۔۶۳
شاہین۔۸۰
شعائر اللہ خاں رامپوری۔۶۷،۱۳۶،
شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی۔۵۸
شفیق، محمد سہیل۔۷۸،۱۷۵،۱۹۴،
شگفتہ جبیں۔۲۳۰
شمیمہ خاتون۔۱۷۸
شہاب الدین انصاری۔۷۲
شہناز رضوی۔۱۱۰
شیخ عائشہ۔۱۶۹
صابر سنبھلی۔۲۱۹
صابرہ بیگم۔۱۷۷
صدیقی، محمد عتیق۔۲۱۳
صدیقی، محمد بکر عالم۔۱۵۲
صفدر علی خاں۔۱۴۶
ضیاء الدین انصاری،۲۳،۵۶،۶۵،۱۵۳،
ضیاء، عبید الرحمٰن۔۱۲۶
طاہرہ انور ملک۔۲۳۳،
ظفر آمنہ۔۱۰۶
ظفیر الحسن، محمد۔۷۴،۱۰۸
عابد حسین شاہ۔۱۳۵
عارف اقبال۔۱۵،۸۵،۲۳۴،۲۳۵،
عاقل خاں، محمد۔۲۴،۲۲۲،۲۲۳،۲۲۴،
عباسی، شگفتہ یاسمین۔۸۷
عبد الباری۔۳۹
عبد الرحمٰن۔۹۹
عثمانی، شفیع احمد۔۱۰۴
عثمانی، محمد ہارون۔۱۷۰
عرشیہ رضوی۔۱۱۵
عطا عابدی۔۱۵۴
عطاء خورشید۔۵۵،۱۳۹،۱۸۵،۲۰۰،
عطاء اللہ خاں، محمد۔۱۶۴
علوی، شکیلہ یاسمین۔۳۴
علیم الدین، محمد۔۵۰
غلام السلام انصاری۔۱۰
فاروق انصاری، محمد۔۴۴،۴۵،۱۴۵،
فردوس حیدر۔۱۳۳
فرزانہ بیگم۔۱۵۸
فرزانہ خلیل۔۷۱
فیروز احمد۔۹۷
فیروز دہلوی۔۱۱۲
فیضی، نثار احمد۔۱۳۰،۱۵۵،۲۰۶،
قادری، سید صابر حسین شاہ بخاری۔۱۸۴
قدوائی، عبد العلیم۔۱۱۷،۱۳۲،۱۳۴،
قریشی، شمیم بانو۔۱۱۶
قمر سلیم، محمد۔۹۰
کاظمی، ادیب زہرا۔۲۰۴
لطیفی ندوی، محمد وقار الدین۔۸۲
محمد ابراہیم۔۴۱
محمد طاہر۔۱۴۳
محمد عبد الرؤف۔۸۸
محمد عبد اللہ۔۴۱،۱۲۹،۱۸۲،
محمد عرفان۔۲۶
محمد قسیم اللہ۔۱۸۹
محمد کاظم۔۴،۲۱
محمد ثنی۔۵
محمد نعمت۔۳
محمد نور الاسلام۔۱۸۶
مسرور کیفی۔۴۷
مسعود حسن، سید۔۱۹۶،
مشتاق احمد۔۲۲۰۔۲۲۱،
مصباح العثمان۔۲۲،۱۹۳،۲۰۷،
مصباحی، سید ساجد رضا۔۳۰،
مصباحی، محمد صابر رضا۔۱۵۹
مصباحی، محمد قطب الدین رضا۔۳۰
مطیع اللہ خاں۔۵۷
معین الدین۔۱۱۴
موسوی، سید مرتضی۔۸۷
مہر النساء عزیز۔۹۳
نذیر احمد، میاں۔۱۵۷
نسرین اختر۔۲۲۸،۲۲۹،
نسرین بیگم۔۱۸۱
نصر اللہ۔۲۵
نظر برنی۔۷۵،۷۶
نظر عالم، محمد۔۷۷
نظر، انصار اللہ۔۱۳
نقوی سہسوانی، ابراہیم خلیل۔۱۶۳
نقوی، امام مرتضی۔۲۰۸،۲۱۷،
نواز، ملک احمد۔۱۲۸
نورانی، امیر حسن۔۱۹۰
نوروز خاں، شیر۔۱۵۰
نیشنل بک فاؤنڈیشن آف پاکستان۔۱۵۶
وانی، ظفر عبد اللہ۔۱۴۷
ہاجرہ عرفان۔۳۶
ہاشمی، محمود عالم۔۲۳۲
ہما۔۲۲۵
یوسف علی، محمد۔۱۷۶

☆☆☆

ادارہ

تازہ کتب ورسائل: تعارف

مقالات مولانا عبدالسلام خان رامپوری مرحوم، مرتبہ: ڈاکٹر تبسم صابر، ناشر: رضا لائبریری رامپور، ۲۰۱۶ء۔ صفحات: ۲۵۰۔

اس صدی کے انیس بیس برس میں اول درجہ کی جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں اعلیٰ ترین دس بڑی کتابوں کی فہرست میں اس ایک کا بھی اضافہ کرلیں۔

شروع میں مرتّبہ نے مصنف کا تفصیلی تعارف کرایا ہے جس میں ان کی تصانیف مطبوعہ وغیر مطبوعہ دونوں کو مذکور کیا ہے، عبدالسلام خاں پابندی سے اپنے نام کو محمد عبدالسلام لکھتے تھے، اور معارف میں ان کے زیادہ مضامین شائع ہوئے، اور چونکہ اہل معارف اور قارئین معارف مولانا **عبدالسلام ندوی** کے نام سے زیادہ مانوس تھے اس لئے معارف والے احتیاطاً ان جونیئر عبدالسلام صاحب کو رامپوری لکھ کر سینئر مصنف سے الگ پہچان بنادیتے تھے۔

مرتبہ نے یہ اہتمام کیا ہے کہ ان کے مضامین کو تاریخی ترتیب سے شائع کیا ہے، پہلے ۱۹۳۷ء کا مضمون اور آخر میں ۲۰۰۴ء کا مضمون، اس کتاب کے مشتملات مندرجہ ذیل ہیں:

● مصحفی اور اس کے دیوان کا رامپوری نسخہ (۱۹۳۷ء ● اسلام سے قبل کے بعض مشہور کتب خانے ● قدیم اسلامی درسگاہوں کے نصاب کی اصلاح کے متعلق چند بنیادی باتیں (۱۹۵۳ء)، ● واجد علی خاں اشک رامپوری (۱۹۶۰ء): داغ اسکول کے اہم شاعر: [ذاکر صاحب، قاضی عبدالودود، فخرالدین علی احمد کے اہم دوستوں میں] ● باری تعالیٰ قرآنی دلائل کی روشنی میں (۱۹۶۳ء)، ● ابن عربی کا نظریہ وحدتِ وجود (۱۹۶۸ء) ● ذوالقرنین اور کورشِ ایرانی (۱۹۸۱ء) [اس موضوع کو سب سے پہلے مولانا آزاد نے اپنے ترجمان القرآن میں چھیڑا تھا۔ ایک عرصہ کے بعد امتیاز علی عرشی صاحب نے

برہان بابت ستمبر اکتوبر ۱۹۷۴ء میں اسی موضوع پر ایک محققانہ مقالہ لکھا تھا، تیسری نگارش عبدالسلام خاں صاحب کی ۱۹۸۱ء کی مورخہ ہے، جواب کتاب میں شامل ہے]۔

● مُثُلِ افلاطونی، ابنِ عربی کے اعیانِ ثابتہ اور رومی کی صُوَرِ مخزونہ (۱۹۸۸ء) ● عظیم مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر (۱۹۸۸ء) ● محمد علی جوہر اور قومی یک جہتی (۱۹۸۸ء) ● مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا رامپور سے تعلق اور مدرسہ عالیہ کی اصلاح (۱۹۸۸ء) ● ہندستان اور مغرب میں فلسفے کی شرح نگاری کا روایتی انداز اور مسلمانوں کی شرحیں (۱۹۸۹ء) ● مولانا روم اور ان کی مثنوی معنوی (۱۹۹۱ء) ● عرشی صاحب جیسے میں نے پایا اور جانا (۱۹۹۲ء) ● رامپور کے اوقاف (۱۹۹۲ء) ● ترجمہ ''التسویۃ بین الافادۃ والقبول'' مصنفۂ شاہ محبّ اللہ الہ آبادی (۱۹۹۳ء) ● شنکر اچاریہ کا اُپنی شدی وحدت الوجود اور مسلم صوفیا کی تعبیر (۱۹۹۵ء) ● علوم مشرقیہ کے فروغ میں رامپور کا حصہ (۱۹۹۵ء)۔

● بعض قرآنی آیات کی تشریحیں (۲۰۰۴ء) [حضرت آدم کا فرشتوں پر تفوق اور خلافت ارضی کی ان کو سپردگی۔ عربوں کے فرشتے ہاروت وماروت یا ایرانیوں کے دیوتا ہرتات ومرتات۔ حضرت ابراہیم اور اللہ کی دی ہوئی دولت میں مست ومغرور بادشاہ کا مکالمہ۔ جناب باری تعالیٰ کی بارگاہ میں بندے کی دعا کی اجابت یا مقبولیت۔ حضرت ابراہیم کا احیاء موتی کی کیفیت کے متعلق باری تعالیٰ سے سوال۔ قرآن کریم کی آیات کی محکمات اور متشابہات میں تقسیم۔ باری تعالیٰ کے مکر کرنے کا مفہوم اور اس کی طرف مکر کی نسبت کرنے کے معنی۔ یہودیوں کی سوختنی قربانی۔ ایک ہی بیان لفظ شمس کی تانیث وتذکیر اور قرآنی تعبیر کا اعجاز۔ شق جبل یا پہاڑ کا متحرک ہونا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی حیات کے خاص خاص واقعات کا تذکرہ یا قصہ۔ دیگر رسل وانبیاء کے برخلاف حضرت یوسفؑ کے واقعات کا یکجائی ذکر۔ حضرت یوسفؑ کے قمیص کا آگے یا پیچھے سے پھٹا ہونا اور خطا کار کی نشان دہی۔ اقوام وملل کے حالات میں تغیر و تبدل کی قرآنی توجیہ۔ انسان کا امانت الٰہی کے بوجھ کو اٹھالینا۔ باری تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ پر غیبی ید قدرت کا اظہار۔ سامری کی حقیقت حال اور اس کا نبوت موسیٰ سے انکار۔ آسمانوں کا ایک دوسرے کے مطابق ہونا۔ بدوی رحلات کے ایک عجیب وغریب منظر سے تذکیر۔ اصحاب فیل کا اصل مقصد اور وہ کیسے بدل گیا کہ وہ غلط راہ پر ہو لیے۔ کیا آنحضرت ﷺ مسحور ہوئے تھے اور آپ پر جادو کا اثر ہوا تھا۔ معوذتین کا مقصد نزول]۔

☆☆☆

Khuda Bakhsh Library

Journal

No. 195-196 January – June 2019

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

Reg. No. 33424/77
Issue : 195-196
Quarterly Journal

Subscription

Individuals ₹ 400/-
Institutions ₹ 500/-
Foreign Individuals 30$
Foreign Institutions 60$

Editor
Dr. Shayesta Bedar
Director

ख़ुदा बख़्श लाइब्रेरी जरनल

अंक 195–196 जनवरी–जून 2019

Opinions expressed by contributors are not necessarily those of the editor.

Printed by Md. Jawaid Ashraf at Pakiza Offset, Shahganj, Patna & published by Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna-800 004.

CONTENTS
Journal No. 195-196

English/Hindi Section

▪ Life and Career of Aram Shah	*by* Dr. Rehana Begum	1-10
▪ Remembering Maulana Azad	(KBL)	1-46

Urdu Section

▪ Editorial	-	v
▪ Letters of Raheed Ahmad Siddiqi *to* S.K. Bhatnagar	*comp. by* Dr. Zakia Jeelani	1
▪ Fahmeeda Riyaz	*by* Dr. Ghulam Shabbir Rana, Dr. Islam Khan, Dr. Sadia Iqbal	103
▪ Not owned by Maulana Azad : *Ghubar-e Khatir's Muqaddima*	*by* Ed.	120
▪ Dumb Speakers of Contemporary Urdu literature	*by* Dr. Iftekhar Imam Siddiqi	143
▪ Remembering Kaifi Azami	*by* KBL	145
▪ *Al-Budoorul Bazigha*	*by* Dr. Abdul Bari	157
▪ Index of Indices	*by* Dr. S. Masood Hasan	162
▪ New Arrivals: Books/Periodicals	*by* Ed.	191

Our Contributors

- *Dr. Abdul Bari, Formerly Professor Arabic, Muslim University, Aligarh*
- *Dr. Ghulam Shabbir Rana, Mustafabad, Jhang City, Pakistan*
- *Dr. Iftekhar Imam Siddiqi, Editor Monthly Sha'ir, Mumbai*
- *Dr. Mohammad Islam Khan, Rashtarya Sahara*
- *Dr. Rehana Begum, Ameer House, House No. 157/60, Diwan Daya Ram, Riti Chock, Gorakhpur*
- *Dr. Sadia Iqbal, Rashtarya Sahara*
- *Dr. Syed Masood Hasan, Khuda Bakhsh Library, Patna*
- *Dr. Zakia Jeelani, Muzammil Manzil Compound, Civil Lines, Aligarh*

Life and Career of Aram Shah
1210 – 1211 AD

Dr. Rehana Begum

Kutb-ud-din Aibak established Turkish Sultanate in India and made Delhi the capital of his kingdom. He ruled as a representative of Shahab-ud-din Mohammad Ghauri from 1192 to 1206 AD and as a Sultan from 1206 to 1210 AD. During playing the Chaugan (Polo) at Lahore he fell down from his horse and died. The sudden death of Kutb-ud-din Aibak at Lahore 4 November, 1210 AD in the midst of the threatening dangers from all sides, placed the infant Turkish kingdom in India in even worse condition. The difficult task which the late Sultan had taken up was still unaccomplished when he met his doom early in the year 1210 AD leaving his Indian kingdom in a confused order. Consequently, as the Muslim kingdom of India could not remain without a Chief, the nobles, officers of Lahore, raised Aram Shah to the throne of Delhi and treated him as the successor of the late Sultan Kutb-ud-din Aibak in India.

With the accession of Aram Shah to the throne the first question arises as to who he was and what was his relation with Sultan Kutb-ud-din Aibak, because our historians are diagonally opposed in identifying Aram Shah's descent, so this question requires a special treatment. To start with, we find clear cut versions about his identification. The first set of historians says that Aram Shah was the son and successor of Sultan Kutb-ud-din Aibak. The second group of historians mentions that Aram Shah was the brother of Kutb-ud-din Aibak. According to the third version he was none but an

adopted son of the late Sultan Aibak. And lastly some scholars assert that Aram Shah was not even a relative of Kutb-ud-din Aibak, but was he elevated to the throne at Lahore and was presented as a son to be an heir to rule as a puppet in the hands of some ambitious nobles.

Now let us examine the above versions one by one separately. In the chapter on Aram Shah in Tabkat-e-Nasiri, contemporary historian Minhaj-us-Siraj after few lines, he himself writes that Kutb-ud-din Aibak had three daughters of whom two, one after the death of the other, were wedded to Malik Nasiruddin Qubacha and the third was married to iltutmish.[2] This, therefore, makes no reference to Aram Shah. It appears that though, Minhaj-us-Siraj was himself not very much certain about the identity of Aram Shah. But the view that Aram Shah was the son of Kutb-ud-din Aibak has been further supported by many other works like Lubb-ut-Tawarikh.[3] Tabqat-e-Akbari[4] and Tarikh-e-Farishta[5] respectively. The Intikhab-al-Muntakhab shows that Aram Shah after his father's death ascended the throne.[6] Yahya bin Abdullah Sarhindi also writes him as the son of Kutb-ud-din Aibak.[7] Similarly according to Tarikh-e-Ghauri Aram Shah was the eldest son of Sultan Kutb-ud-din Aibak.[8] However, Khulasat-us-Tawarikh[9] and Chahar Gulshan[10] both assert that Aram Shah was the so-called son of Kutb-ud-din Aibak. Some of the modern scholars like A.B.M. Habibullah[11] and others also accept Aram Shah to be the son of the late Sultan Kutb-ud-din Aibak.[12]

The second view is held by Abul Fazal who very surprisingly mentions Aram Shah as the brother of Kutb-ud-din Aibak.[13] Abul Fazal, who was a later historian, gives no authoritative arguments. His source of information is found to be weak on corroboration. This is why the other historians take no account of version made by him.

However, the third version is headed by Raverty who

suggests that Aram Shah was an adopted son of Kutb-ud-din Aibak and hailed him with the title of Sultan Aram Shah.[14]

The author of Tarikh-e-Jahan Kusha writes that Kutb-ud-din Aibak had no son but a slave known as Iltutmish who became heir apparent to the throne.[15] This view according to Muhammad Aziz Ahmad, gives the most appropriate expression that Kutb-ud-din Aibak had no son but a slave "Iltutmish" who became heir apparent to the throne and further, he writes that Aram Shah, in fact, was not a relative of Kutb-ud-din Aibak.[16] Sir W. Haig seems to be confused on this point and is not clear whether Aram Shah was the natural or the adopted son of Kutb-ud-din Aibak. This heir apparent was "sometimes described" by him incorrectly "as Aibak's adopted son but usually believed to have been a son of his body".[17] Similarly, Henry George Keene also seems to be confused in establishing the relationship of Kutb-ud-din Aibak with that of Aram Shah because at one place he mentions the latter as the son of Sultan Kutb-ud-din Aibak while the other he controverts his own statement and describes him as only an adopted son.[18]

Lastly, the fourth group of scholars assert that Aram Shah was not a son of Sultan Kutb-ud-din Aibak and in order to avoid the confusion and strike inseparable from a delayed or disputed successor, the nobles of Lahore hurriedly proclaimed him as son. Muhammad Aziz Ahmad belonging to the last group, argues that the new Sultan Aram Shah was neither the son nor the brother of Kutb-ud-din Aibak. "Sultan Aram Shah", according to him "therefore, might have been a Turkish Malik whom his colleagues and friends raised to the throne with a view to retain peace, tranquillity, order and government, as also the probable heir Shams-ud-din Iltutmish was not available on the spot and the throne could not remain vacant so long as he took to return to Delhi."[19] He further writes that, "Kutb-ud-din had no son to succeed. However, a

son was presented to be an heir, but the final choice lay with the Maliks and Amirs. They could choose from among the relations of the ex-King or select a new man altogether. Aram Shah was selected for his weakness to play the part of a mere puppet. Selection by the officers meant that they exacted favours as pre-condition to their support."[20]

In the face of these varied statements, unfortunately Hasan Nizami, a contemporary historian, who furnishes us with a detailed account of Kutb-ud-din Aibak's life and career, does not give any information about Aram Shah. Over-sighting the short reign of Aram Shah, he simply passes on the accession of Iltutmish after the death of Sultan Kutb-ud-din Aibak,[21] which according to him, took place in the year 607 H. (1210 AD).[22]

Under the circumstances aforesaid, it is almost difficult to arrive at a fair conclusion. All the historians, contemporary, later or modern have gone too far from the fact and have simply led their faculty to travel in vain from one extreme to another in order to locate the fact. With the silence of a reliable and contemporary work like Taj-ul-Maasir of Hasan Nizami on the issue there has been left the only other reliable work Tabkat-e-Nasiri of Minhaj-us-Siraj which is certainly the only and the most authentic source for study. Probably relying on the version[23] of this great historian Muhammad Aziz Ahmad assert that Kutb-ud-din Aibak left no son to succeed him and therefore Aram Shah was neither his son nor brother but was merely a Turkish Malik, who was installed at the throne.[24] But Minhaj-us-Siraj is a frank historian and he has clearly mentioned in the case of Shahab-ud-din Muhammad Ghauri that he had no male heir[25] to succeed him and therefore his vast empire was succeeded by his feeble nephew Ghayas-ud-din Mahmud.[26] Similarly, had it been the case also with his another favourite Sultan Kutb-ud-din Aibak, he would never have failed to record it. But here in this case Minhaj-us-Siraj

has not frankly admitted that Aram Shah was not the son of Kutb-ud-din Aibak. His mere mentioning of the name of the Aram Shah as the son and successor of Kutb-ud-din altogether rejects the theory of Muhammad Aziz Ahmad whose statement is purely based on the second version of our historian. It is more likely that Aram Shah, who was weak and feeble son of Kutb-ud-din Aibak, pleasure loving unlike his father and incapable to hold the reins of government, failed to attract most of our historians and Minhaj-us-Siraj, who was a strong admirer of Kutb-ud-din Aibak, is not exception. That is why perhaps, he makes only a passing reference as to the identity of Aram Shah who was the real son and successor of Kutb-ud-din Aibak.

Fall of Aram Shah:

It is quite clear from the above that due to the call of the urgency, the chiefs and the nobles of Lahore installed Aram Shah the son of Kutb-ud-din Aibak, as the heir and successor of late Sultan, though ill-adopted, he was destined to govern such a vast empire. Nasir-ud-din Qubacha, one of the slave commanders of Shahab-ud-din Muhammad Ghauri, who was then the governor of Sindh, taking advantage of the weakness of the new Sultan, marched towards Uch[27] and Multan[28] in order to extend his dominion. He consequently captured these ones along with Sherwan, Dewal and other places.29 His authority according to Minhaj-us-Siraj, reached as far as the sea shore and many forts, cities and towns of the territory of Sindh including Tabarhinda, Kuhram and Sarsuti, fell quickly into province of his power.[30] He is also said to have occupied Lahore several times.[31] At the same time the Khilji rulers of Bengal also revolted and asserted for their independence, similarly, other dependent chiefs also threw off their allegiance in many parts of the empire.[32]

The nomination of Aram Shah as the successor of Sultan Kutb-ud-din Aibak was not supported by other nobles, particularly, the nobles of Delhi. Consequently, the nobles, amirs and the Chiefs were divided into two open groups, the Chiefs of Lahore who supported the nomination of Aram Shah as the Sultan of Delhi, and the Chiefs of Delhi, who challenged this nomination. The time was hard and tough which demanded a strong and powerful man, but Sultan Aram Shah was on the contrary, not endowed with requisite qualities and was completely unfit to deal with the problems. Therefore, the Amirs of Delhi rejected this appointment. In the meantime, Iltutmish[33] had already earned his name and fame during the governorship of Badayun.[34] In fact, Sultan Kutb-ud-din Aibak had regarded him as his son[35] and had given him the governorship of Badayun.[36] Ultimately, the nobles of Delhi in consultation with the other discontented nobles and headed by the Sipah-salar[37] Amir Ali Ismail who was the Amir-e-Dad[38] of the capital city[39] despatched an invitation to Iltutmish, at Badayun[40] to hasten, to Delhi and assume the throne.[41] Iltutmish at once accepted the offer and marched hurriedly without hesitation as the head of his army and by the assistance of his party he met with a cordial reception. He captured the fort and city of Delhi in 607 H.[42] or 1210 AD, and the whole territory around the capital city was subsequently brought under his sway.[43]

On the other hand, in order to dethrone Iltutmish from Delhi, Aram Shah collected for his assistance a large army comprising mainly of Qutbi Amirs and Maliks. As also managed to raise a powerful army from Amroha and other parts of the dominion. Thus, Aram Shah having recruited a strong force advanced towards Delhi to punish Iltutmish. The challenge thrown by Aram Shah was promptly responded by Iltutmish, who had already possessed the capital city. The

contending armies met each other in the plan facing the city and after a feeble resistance put forth by Aram Shah and his army the former was ultimately defeated and put to rout. Most of the followers of Aram Shah including both Aqsanqar and Farrukh Shah, were slain.[44] Aram Shah himself in all probability was martyred by his adversary.[45] The reign of Aram Shah, which was terminated within a space of one year,[46] proved short lived. During this short reign, the newly founded Turkish Empire, India broke into pieces and was majorly subdivided into four portions. The territory of Sindh was under the possession of Nasir-ud-din Qubacha; the dominion of Delhi was dominated by Iltutmish; the territory of Lakhnauti was occupied by the Khilji Maliks and Sultans; and the state of Lahore which according to the flux of circumstances, was occupied sometimes by Qubacha and sometimes by Iltutmish until Qubacha was finally defeated at the hands of Iltutmish in the year 1227 AD.[47]

Thus, it is quite clear from the above description that Aram Shah's short reign was one of a total failure. Had he survived a title more as a Sultan of Delhi, the Muslim Kingdom of India was sure to have been dismantled. But thanks to the timely emergence of Iltutmish into a powerful and capable person as regards the governance of the empire that the Muslim Kingdom was saved from falling into dust. The doom of Aram Shah was inevitable before such a worth man like Iltutmish. And with the defeat and overthrow of Aram Shah from the Delhi Sultanate, sometime in the end of 1210 AD, came the end of the line of the first ruling family over the newly founded Turkish kingdom in North India. The family of Sultan Iltutmish immediately thereafter succeeded his master Sultan Kutb-ud-din Aibak's family which, however, lasted for about half a century.

Reference:

1. *Minhaj-us-Siraj*, *Tabkat-e-Nasiri*, English translation, Raverty, *Tabkat-e-Nasiri*, vol. I, p.528.
2. Raverty, *Tabkat-e-Nasiri*, vol. I, pp.529-30.
3. Rae Bind Rae, *Lubb-ut Tawarikh*, MS., Abd-us-Salam Collection, 316, 86, p.9.
4. Nizam-ud-din Ahmad, *Tabqat-e-Akbari*, Nawal Kishore Press, Lucknow, p.55, English translation by D. De, vol. I, Calcutta, 1927, p.60. According to the same authority "he had no other son."
5. Farishta, *Tarikh-e Farishta*, English translation Briggs, *Tarikh-e Firishta*, vol. I, p.203.
6. Abd-ul-Shakur, *Intikhab-ul Muntakhab*, MS., Abd-us-Salam Collection, 87/317, p.170.
7. Yahya bin Abdullah Sarhindi, *Tarikh-e-Mubarak Shahi*, ed. by Dr. Hidayet Hussain, Baptist Mission Press, Calcutta, p.16.
8. *Tarikh-e-Ghauri*, MS., Abd-us-Salam Collection, Aligarh Muslim University, Aligarh, 11/145, p.18.
9. Sujan Rai (or Sujan Singh), *Khulasat-ut Tawarikh*, ed. by K.B. Zafar Hasan, Delhi, 1918, p.18.
10. Chander Bhan, *Chahar Gulshan*, MS., Abd-us-Salam Collection, 62/292.
11. A.B.M. Habibullah, The Foundation of Muslim Rule in India, 1961, pp.91-92.
12. Lane Poole, Medieval India, p.70; and the Struggle for Empire, p.131.
13. Raverty, *Tabkat-e-Nasiri*, op. cit., p.529 also refer f.n.4.
14. Ibid., p.529 and f.n.4; *Haji-ud-Dabir*, *Zefart-e-Walihi*, ed. by E.D.Ross under title of "An Arabic History of Gujarat", London, 1921, vol. II, p.686.
15. Ala-ud-din Ata Malik Juraini, *Tarikh-e-Jahan Kusha*, Gibb Memorial Series, 1912, vol. II, p.611.
16. Muhammad Aziz Ahmad, Early Turkish Empire of India, 1949, p.152, f.n.1.
17. Sir W. Haig (ed.), The Cambridge History of India, vol. III, p.51.
18. Henry George Keene, Bibliographical Dictionary, London, 1894, pp.77, 320.
19. Muhammad Aziz Ahmad, Political History and the Institution of the Early Turkish Empire of Delhi (1206-1290 AD), 1949, p.152.
20. Ibid., p.153.
21. Elliot and Dowson, History of India as told by its own

Historians, vol. II (with introduction by Muhammad Habib) Aligarh Edition, p.237.

22. Ibid., p.237.
23. In the second version *Minhaj-us-Siraj* mentions only three daughters of Kutub-ud-din Aibak and makes no reference of Aram Shah. Raverty, *Tabkat-e-Nasiri*, vol. I, pp.529-30.
24. Early Turkish Empire of India, p.152-153.
25. Raverty, *Tabkat-e-Nasiri*, vol. I, p.496.
26. Ibid., p.518.
27. It became the Chief City of Upper Sindh under Qubacha.
28. *Tabkat-e-Nasiri*, vol. I, pp.530-32.
29. Ibid., pp.530-32, 34.
30. Ibid., p.532.
31. Ibid.,
32. Briggs, *Tarikh-e-Farishta*, vol. I, p.203.
33. Iltutmish was the slave and son-in-law of Kutb-ud-din Aibak. He was also a favourite of Shahab-ud-din Muhammad Ghauri who once instructed Kutb-ud-din Aibak says: "Treat I Altamash well for he will distinguish himself." *Tabkat-e-Nasiri*, vol. I, p.605.
34. At this time, and for sometime after, the fief of the territory of Badayun was the greatest in the Delhi.
35. Raverty, *Tabkat-e-Nasiri*, vol. I, pp.530-603.
36. Briggs, *Tarikh-e-Farishta*, vol. I, p.203; *Tabkat-e Nasiri*, vol. I, p.530-604; Political History and the Institution of the Early Turkish Empire of Delhi, p.153, according to Muhammad Aziz Ahmad Iltutmish was given the fief of Badayun which signifies his wish to make his heir apparent. But if we urge that Aram Shah was the son of Kutb-ud-din Aibak, it is hardly to be believed that in the presence of his own son Kutb-ud-din Aibak ever showed his wish to be succeeded by his slave governor in the place of his own son. Keene, however, asserts that Iltutmish was an adopted son of Kutb-ud-din Aibak, History of India, vol. I, p.320.
37. Commander of troops.
38. Lord Justice of the capital of Delhi.
39. Here we find some difference in the writings of Muhammad Aziz Ahmad and *Minhaj-us-Siraj*. Aziz Ahmad mentions that Amir Ali Ismail the Sipah Salar (Commander of Forces) and Amir-e-Das (Chief Judge) as the leaders of nobles of Delhi who invited Iltutmish to ascend the throne of Delhi-Political History and the institution of the Early Turkish Empire of Delhi, p.153. But *Minhaj-us-Siraj* clearly gives only one name that Ali Ismail

who was also the Amir-e-Dad (Lord Justice) of the Capital of Delhi who with the consultation of the other nobles had invited Iltutmish to come to Delhi – Raverty – *Tabkat-e-Nasiri*, vol. I, p.605.

40. According to Badayun, Iltutmish came from Haridwar and Badayun to Delhi, *Muntakhab-ut-Tawarikh*, Calcutta, 1868, p.61. But considering the geographical locations of these places the statements of Badayuni seems to be incorrect.
41. *Tabkat-e-Nasiri*, vol. I, pp.605-606; *Tarikh-e-Farishta*, vol. I, p.203.
42. *Tabkat-e-Nasiri*, vol. I, pp.606, Khulasat-ut-Tawarikh, p.190 has the year 1211 AD. Similarly the Cambridge History of India, vol. III, p.51, places the accession of Iltutmish on the throne of Delhi in later half of the year 1211 AD.
43. Raverty, *Tabkat-e-Nasiri*, vol. I, p.606.
44. *Tarikh-e-Farishta*, Nawal Kishore Press, Lucknow, vol. I, p.65.
45. Raverty, *Tabkat-e-Nasiri*, vol. I, p.530. According to some "the decree of destiny reached Aram Shah". Sir W. Haig writes that Aram Shah was defeated and captured by Iltutmish. But all these are not correct. In fact, we find no trace of Aram Shah afterwards. Therefore, it is highly likely that Aram Shah must have been put to death either in the engagement or sometime later by the orders of Iltutmish.
46. *Lubb ut-Tawarikh*, p.10; *Tarikh-e-Farishta*, vol. I, p.204; *Tabaqat-e-Akbari*, p.55. According to Habibullah Aram Shah ruled for not more than eight months. (The foundation of Muslim Rule in India, p.92) and Muhammad Aziz Ahmad thinks that Aram Shah's rule was terminated within the space of one year of Political History and the Institution of the Early Turkish Empire of Delhi, p.77). According to one source Aram Shah ruled upto 1215 AD. See Habibullah, A.B.M., The Foundation of Muslim Rule in India, pp.106-107 and footnote 20. But this is no way a correct statement, as we find Iltutmish's earliest win which was issued as early as in 1211 AD. Catalogue of coins in Indian Museum, II, Int., p.6; Epigrapia Indo-Muslemica, 1911-12, p.3. But in his book, pp.106-107 footnote 20, Habibullah incorrectly quotes Raverty's Minhaj-us-Siraj's, p.589, note 4, which is not available. Raverty's book is not shown this evidence.
47. Raverty, *Tabkat-e-Nasiri*, vol. I, pp.530-31.

***

मौलाना आज़ाद की याद में

<u>लेखक</u>

- महात्मा गांधी,
- जवाहरलालनेहरू,
- राजेन्द्र प्रसाद,
- एस0 राधा कृष्णन,
- ज़ाकिर हुसैन
- और दूसरे

खुदा बख़्श ओरियन्टल पब्लिक लाइब्रेरी
पटना

11 नवम्बर 2019 राष्ट्रीय शिक्षा दिवस पर
मौलाना आजाद को खुदा बख़्श लाइब्रेरी का नज़राना

दो शब्द

मौलाना आजाद का जन्म मक्का (सऊदी अरब) में सन् 1888 ई० (जिलहिज्जा 1305 हिजरी) में हुआ था जहाँ उनके पिता हिन्दुस्तान से जाकर बस गये थे और वहीं विवाह कर लिया था। मौलाना आजाद के जन्म के कुछ ही वर्ष पश्चात् उनके पिता भारत वापस आ गये और कलकत्ता में बस गये। आजाद की बचपन से विद्या और साहित्य में अभिरुचि थी। यही अन्वेषक प्रवृत्ति उनको इराक, मिस्र और दूसरे देशों के सफर पर ले गई। स्वाधीनता-संग्राम में वह लड़कपन से ही रुचि लेने लगे थे जिसके परिणाम स्वरूप 1916 ई० में उन्हें राँची में लम्बी अवधि तक नजरबंदी मिली, जिससे वह 1920 ई में मुक्त हुए। 1923 ई० में वह पहली बार कांग्रेस के अध्यक्ष निर्वाचित हुए और 1940 ई० में एक बार फिर राष्ट्र ने यह प्रतिष्ठा प्रदान की। इस बार वह छह वर्षों तक निरन्तर अध्यक्ष के पद को सुशोभित करते रहे। कांग्रेस के इतिहास में इतनी लम्बी अवधि तक कोई दूसरे नेता अध्यक्ष नहीं रहे थे। इसी लम्बी अवधि में स्वतंत्रता संबंधी समझौते की सभी कार्रवाइयाँ उन्हीं के नेतृत्व में सम्पन्न हुई।

उन्होंने अनेक समाचार-पत्र और पत्रिकाओं का प्रकाशन और सम्पादन किया जिनमें 1903-1904 ई० का "लेसानुस सिद्क" और 1912-1916 ई० के "अल-हिलाल" तथा "अल-बलाग" सुप्रसिद्ध हैं। कुरान की उनकी सुविख्यात टीका "तर्जुमानुल कुरान" और उनके पत्रों का संग्रह 'गुबारे खातिर" इस्लामी विद्या और साहित्य के प्राण हैं। जीवन के अंतिम दिनों में मौलाना आजाद ने "इण्डिया विन्स फ्रीडम" (India's Wins Freedom) नामक स्वतंत्रता-प्राप्ति संबंधी महत्त्वपूर्ण दस्तावेजी पुस्तक यादगार स्वरूप लिख छोड़ी।

मौलाना आजाद का देहान्त 22 फरवरी, 1958 ई० को दिल्ली में हुआ।

एक तरीक़ा निकाला है कि मौलाना आजाद कियों बड़े थे, किया बड़ाई थी उनमें, इस विषय पर अपने बड़ों : गांधी जी, जवाहरलाल नेहरू, राजेन्द्र प्रसाद, राधा कृष्णन, ज़ाकिर हुसैन और दूसरों की बातें आपके सामने रख दें कि वह बड़ाई पूरी पूरी आप के दिल में भी उतर जाए।

अपनी अन्तिम बात कहते कहते ख्याल आया ये तो कुछ न हुआ, हम अपनी ही कहते रहे, जिसका सारा जहूरा है उसकी बात तो उसके किसी खास कहन पर खत्म होनी चाहिए। 1940 ई0 के आल इन्डिया कांग्रेस के रामगढ़ सेशन को एड्रेस करते हुए सभापति मौलाना आजाद ने कहा था, उस समय कांग्रेस का अध्यक्ष राष्ट्रपति का दर्जा रखता था कि उस समय कांग्रेस ही कांग्रेस थी और क़ौम बटी हुई न थी तब राष्ट्रपति आज़ाद ने कहा था :

"हिन्दुस्तान के लिए प्रकृति का यह निर्णय हो चुका था कि उसकी भूमि मनुष्य की विभिन्न नस्लों, विभिन्न संस्कृतियों और विभिन्न धर्मों के काफिलों की मंजिल बने। अभी इतिहास का प्रभात पूर्णरूपेण प्रकट भी नहीं हुआ था कि उन काफिलों का आगमन आरम्भ हो गया और फिर एक के बाद दूसरे के आने का क्रम जारी रहा। इसकी विशाल भूमि सबका स्वागत करती रही और इसकी उदार गोद ने सबके लिए जगह निकाली। उन्हीं काफिलों में एक अन्तिम काफिला हम इस्लाम धर्मावलम्बियों का भी था। यह भी पिछले काफिलों के पद-चिन्हों पर चलता हुआ यहाँ पहुँचा और सदा के लिए बस गया। यह संसार के दो भिन्न धर्मों और संस्कृतियों की धाराओं का संगम बना। यह पहले गंगा और यमुना की धाराओं की तरह एक दूसरे से अलग बहते रहे, फिर जैसा कि प्रकृति का अटल नियम है, दोनों को एक संगम में मिल जाना पड़ा। इन दोनों का मेल इतिहास की एक महत्वपूर्ण घटना थी। जिस दिन यह घटना घटी उसी दिन से प्रकृति के परोक्ष हाथों ने पुराने हिन्दुस्तान की जगह एक नये हिन्दुस्तान के ढालने का काम शुरू कर दिया। हम अपने साथ अपना भंडार लाये थे और यह भूमि भी अपने भंडारों से भरपूर थी। हमने अपनी सम्पत्ति इसके हवाले कर दी और इसके खजानों के दरवाजे हमारे लिए खोल दिये गये। हमने इसे इस्लाम के भंडार की वह सबसे कीमती चीज दे दी जिसकी इसे सबसे

अधिक आवश्यकता थी। हमने इसे जनतंत्र और मानवीय समता का संदेश पहुँचाया।

इतिहास की पूरी ग्यारह शताब्दियाँ इस घटना पर बीत चुकी हैं। अब इस्लाम भी इस भूमि पर वैसा ही दावा रखता है जैसा दावा हिन्दू धर्म का है। यदि हिन्दू धर्म कई हजार वर्षों से इसके निवासियों का धर्म रहा है तो इस्लाम भी एक हजार वर्ष से यहाँ के लोगों का धर्म रहा है। जिस प्रकार आज एक हिन्दू गर्व के साथ कह सकता है कि वह हिन्दुस्तानी है और हिन्दू धर्मावलम्बी है, ठीक इसी तरह हम भी गर्व से कह सकते हैं कि हम हिन्दुस्तानी हैं और इस्लाम धर्मावलम्बी हैं। मैं इस वृत्त को इससे ज्यादा फैलाऊँगा, मैं हिन्दुस्तानी ईसाई का भी यह हक स्वीकार करूँगा कि वह आज सिर उठाकर कह सकता है कि मैं हिन्दुस्तानी हूँ और हिन्दुस्तान के निवासियों के एक धर्म यानी ईसाई धर्म का अनुयायी हूँ।

ग्यारह शताब्दियों के सम्मिलित इतिहास ने हमारे हिन्दुस्तानी जीवन के सभी कोनों को रचनात्मक सामग्रियों से भर दिया है। हमारी भाषाएँ, हमारा काव्य, हमारा साहित्य, हमारा समाज, हमारी रुचि, हमारी पोशाक, हमारे रस्मो-रिवाज (प्रथाएँ), हमारे दैनिक जीवन की अगणित वास्तविकताएँ— कोई भी कोना ऐसा नहीं है जिसपर इस सामाजिक जीवन की छाप न लग सकी हो। हमारी बोलियाँ अलग-अलग थी, मगर हम एक ही भाषा बोलने लगे। हमारे रस्मो-रिवाज एक दूसरे से भिन्न थे, मगर उन्होंने मिलजुल कर एक नया साँचा पैदा कर दिया। हमारी पुरानी पोशाक इतिहास की पुरानी तस्वीरों में देखी जा सकती है, मगर अब वह हमारे शरीरों पर नहीं मिल सकती। ये सभी मिश्रित पूँजी हमारी संयुक्त राष्ट्रीयता की एक सम्पत्ति है और हम इसे छोड़कर उस युग की ओर लौटना नहीं चाहते जब हमारी यह मिली-जुली जिन्दगी शुरू नहीं हुई थी। हममें यदि ऐसे हिन्दू मस्तिष्क हैं, जो चाहते हैं कि एक हजार वर्ष पहले का हिन्दू जीवन वापस लाएँ तो उन्हें मालूम होना चाहिए कि वे एक स्वप्न देख रहे हैं और वह कभी पूरा होने वाला नहीं। इसी तरह अगर ऐसे मुसलमान दिमाग मौजूद हैं जो चाहते हैं कि अपनी उस गुजरी हुई संस्कृति और समाज को फिर ताजा करें जो वे एक हजार वर्ष पूर्व ईरान और मध्य एशिया से लाए थे, तो मैं उनसे भी कहूँगा कि वे इस सपने से जितना जल्द जाग्रित हो जाएँ

उत्तम है, क्योंकि यह एक अप्राकृतिक विचार है। और वास्तविकता की धरती पर ऐसे विचार उग नहीं सकते।

हमारी इस एक सहस्त्र वर्ष की सामाजिक संस्कृति और जीवन ने एक संयुक्त राष्ट्रीयता का साँचा ढाल दिया है। ऐसे साँचे बनाये नहीं जा सकते, वे प्रकृति के परोक्ष हाथों से शताब्दियों में अपने आप बना करते हैं। अब यह साँचा ढल चुका और भाग्य की मुहर इसपर लग चुकी, हम पसंद करें। या न करें मगर अब हम एक हिन्दुस्तानी राष्ट्र और अविभाज्य हिन्दुस्तानी राष्ट्र बन चुके हैं। पृथकता या विभाजन का कोई कृत्रिम विचार हमारे इस एक होने को दो नहीं बना सकता, अद्वैत को द्वैत में परिवर्तित नहीं कर सकता। हमें प्रकृति का निर्णय स्वीकार्य होना चाहिए और अपने भाग्य निर्माण में लग जाना चाहिए।"

यह थे मौलाना आजाद और उनका राष्ट्रीपति सिंहासन से दिया गया गया इतिहासिक खुत्बा (address), जो आज भी हिन्दुस्तान में बसी भिन्न भिन्न क़ौमों के दिलों को जोड़ता है और गरमाता है।

डाइरेक्टर
खुदा बख़्श ओरियन्टल पब्लिक लाइब्रेरी, पटना
11 नवम्बर 2019

मुझे मौलाना अबुल कलाम आजाद के साथ देशी
और कौमी सेवा करने का गौरव प्राप्त है।
इनकी राष्ट्रीयता उतनी ही दृढ़ है जितना
इनका इस्लाम पर ईमान और
विश्वास।

सेवा ग्राम, वार्धा
मई 18, 1940 ई०

—महात्मा गांधी

जवाहरलाल नेहरू

अबुल कलाम आजाद

किसी परिचित व्यक्तित्व के सम्बन्ध में कुछ विचार व्यक्त करना कितना कठिन काम है, और फिर यह कठिन से कठिनतर हो जाता है, जब वह व्यक्ति ऐसा राजनीतिक मित्र हो जो राष्ट्रीय कार्यों की सब जिम्मेदारियों और कष्टों में साथी रहा हो। यह कारण है कि मौलाना अबुल कलाम आजाद के सम्बन्ध में कलम उठाना मेरे लिए कोई आसान काम नहीं है।

लगभग बाईस वर्ष हुए जब पहले-पहल मेरी मुलाकात मौलाना से हुई। किन्तु मौलाना की विद्वत्ता, राष्ट्रीय कार्यों में दृढ़ता और महायुद्ध के दौरान उनकी नजरबंदी के सम्बन्ध में उससे पहले ही बहुत कुछ सुन चुका था और उनसे मिलने के लिए बेचैन था। आयु की दृष्टि से अभी उनकी जवानी थी, लेकिन उनके चेहरे पर परिपक्वता और प्रौढ़ता के गहरे चिह्न थे, और इस तरह उनका स्थान काँग्रेसी बुजुर्गों के बीच कायम था। चूंकि मुझे खुद भी उस वक्त काँग्रेस के भीतरी हलकों से उतना गहरा सम्पर्क-सम्बन्ध नहीं था, इसलिए उस वक्त इन्हें सिर्फ दूर से अध्ययन करने का मौका मिलता रहा। लेकिन उसके बाद कांग्रेस कार्य समिति की बैठकों में मुझे उनका ध्यानपूर्वक अध्ययन करने का अवसर मिला। और विशेषकर पिछले दस-बारह वर्ष से तो मुझे उनसे बहुत घनिष्ठ सम्पर्क रहा है। अगर हमारी कारावास और मेरी हिन्दुस्तान से अनुपस्थिति की अवधि को उसमें से अपवाद कर दिया जाए तो काँग्रेस की दैनिक कार्रवाइयों और उसके महत्वपूर्ण प्रस्तावों और निर्णयों में उनकी मित्रता की निरन्तर प्रतिष्ठा प्राप्त रही है। काँग्रेस के इतिहास में और बल्कि हिन्दुस्तान के इतिहास में

बहुत कम लोगों को इस हकीकत की जानकारी है कि कांग्रेस के प्रस्तावों और संकल्पों की काट-छाँट और निर्मिति में उनका जबर्दस्त हाथ किस प्रकार कार्यरत रहा है। चाहे वह अध्यक्ष हों, या कार्य समिति के आम सदस्य, उनकी स्वतंत्र रायें असाधारण रूप में महत्वपुर्ण समझे थे, क्योंकि उन रायों और मशवरों के परोक्ष में ज्ञान-बोध और सूझ-बूझ की असाधारण परिपक्वता और घुलावट दिन प्रति-दिन प्रकरतर होती जा रही थी।

मौलाना आम दुनिया से बिल्कुल भिन्न और निराले राजनेता हैं। आप में एक ऐसे सफल राजनेता के स्वभाव की प्रवृत्तियाँ नहीं है जो कठोर और असंवेदनशील होकर आक्रमण करने और आक्रमण सहने में सक्षम होते हैं। आपका स्वभाव बिल्कुल इसके विपरीत है। वह बेहद शर्मीले और एकान्त-प्रिय हैं, और इसके अतिरिक्त उनके पहलू में एक अति संवेदनशील हृदय है। एक प्रभावशाली और प्रतिष्ठित वक्ता होने के बावजूद शोर-गुल और हंगामों से बहुत घबराते हैं। उनको जनसाधारण में भाषण देने के लिए तैयार करना कोई आसान काम नहीं। सच यह है कि उनकी वास्तविक विशेषता विद्या और ज्ञान का क्षेत्र था। परिस्थितियों की नजाकत ने उन्हें सक्रिय और अपदायुक्त जीवन जीने के लिए लाचार कर दिया है।

मौलाना को देखकर मुझे अक्सर वह फ्रांसीसी कामूसी याद आ जाते हैं जो फ्रांसीसी क्रान्ति के कुछ समय पहले वहाँ मौजूद थे। भूतकाल के अन्त-र्राष्ट्रीय इतिहास में उनकी दिव्य दृष्टि वास्तव में आश्चर्यजनक है। और फिर यह विस्तृत ज्ञान उनके मस्तिष्क में विचित्र नियंत्रण और क्रम के साथ वर्तमान है। उनका मानस बिल्कुल साफ और सुलझा हुआ है। और ऐसा मालूम होता है कि उन्होंने तर्क-विज्ञान और दर्शनशास्त्र के किसी प्राचीन स्कूल में शिक्षा प्राप्त की है। उनका आम रवैया औचित्यप्रिय है। परोक्ष रूप में एक ऐसा इन्सान मौजूद है जो विद्या के पहाड़ों को नम्र और नाजुक बनाकर कभी-कभी उच्च लेकिन शुष्क विनोद की सृष्टि करता है।

यदि इस प्रकार की एकान्तप्रियता और शर्मीलापन उनके स्वभाव की विशेषता न होती तो वह देशी और कौमी कामों में इससे भी बढ़-चढ़ कर हिस्सा लेते, क्योंकि इनकी लेखनी में एक जादू और इनके होठों में एक

चमत्कार है जो हजारों असंवेदनशील हृदयों को गतिशील और सक्रिय होने की तरफ प्रेरित कर सकता है। हमने यह चमत्कारिक आवाज अब जनता के बीच बहुत ही कम यदा-कदा ही सुनी है। और दुर्भाग्यवश उन्होंने अपनी जादूई लेखनी से भी पहले की तरह दिलआवेजियाँ और रंगीनियाँ पैदा करनी छोड़ दी है।

मुझे हमेशा उनके लेखकीय जीवन से विमुखता पर अफसोस हुआ है, क्योंकि जो भाषा वह लिखते हैं वह अधिक-से-अधिक अर्थपूर्ण शब्दों से युक्त होती है। चढ़ती जवानी ही में उन्होंने न सिर्फ हिन्दुस्तान बल्कि पश्चिमी एशिया, अरब देशों और मिस्र से प्रशंसांजलि प्राप्त कर ली थी। यह केवल उनकी लेखनी की बदौलत था और अब यह हालत है की अगर उन अरबी बोलने वाले देशों में कोई पर्यटक हिन्दुस्तान से जाता है तो उससे अबुल कलाम के सम्बन्ध में जरूर दरयाफ्त किया जाता है। अगर उन्होंने अपना यह लेखकीय संघर्ष जारी रखा होता तो आज हमारे राष्ट्र की साफ और सुलझी हुई चिन्तन-पद्धति और इस कारण सच्चे कर्म-पथ के निर्धारण में बहुत हद तक बहुमूल्य शक्ति प्राप्त होती।

यह केवल परिस्थितियों की मांग है कि वह दूसरे कर्तव्यों और उत्तर-दायित्वों को अपने कंधों पर लेने के लिए लाचार हो गये। और अब यह निर्णय इतिहास करेगा कि उन्होंने यह सब कुछ किस प्रकार सम्पन्न किया। लेकिन जिन्हें उनकी बहुत अधिक निकट से देखने की प्रतिष्ठा प्राप्त है वे इतिहास के निर्णय के लिए प्रतीक्षा करने का कष्ट क्यों करें; वह हमारे लिए और देश एवं कौम के लिए शक्तियों का एक दृढ़ पहाड़ रहे हैं। हम उनकी राय से सहमत हुए या असहमत, हम हमेशा निश्चिन्त रहे कि उनकी राय बहुत वास्तविक होती है और हम आसानी से उससे अलग नहीं हो सकते क्योंकि वह राय एक ऐसे अनुभवी और स्पष्ट मस्तिष्क की उपज होती थी जिसे भूत और वर्तमान की विद्या और ज्ञान तथा असाधारण प्रभूत प्रतिभा से युक्त किया गया हो और ये सर्वतोमुखी शक्तियाँ बहुत कम लोगों का अंश होती हैं।

उस महिमामय हिन्दुस्तानी से नई पौध को प्राप्त करने के लिए बहुत कुछ है। वह एक ही साथ इस्लाम धर्म के जबर्दस्त ज्ञाता (धर्मशास्त्री) और

भारतीय एकता के प्रतिनिधि और टीकाकार हैं और इन दोनों चीजों की एकता में उन्होंने बिल्कुल कठिनाई नहीं महसूस की। उनसे कम ज्ञान वाले लोगों को हिन्दुस्तानी जीवन की भिन्नता में पारस्परिक टकराव दिखाई पड़ता है। लेकिन मौलाना इस आम सतह से बहुत ऊँचे उठे हुए हैं और इन ऊँचाइयों से उन्होंने न केवल इस भिन्नता के परोक्ष में स्थित वास्तविक मिलन और एकता को देख लिया है, बल्कि यह भी मालूम कर लिया है कि हिन्दुस्तान और उसकी कौमी जिन्दगी की विभिन्न दिशाओं की मुक्ति इसी एकता और मेल-मिलाप से संबद्ध है।

मौलाना के स्वर्गवास के बाद

मौलाना अबुल कलाम आजाद के देहान्त से हिन्दुस्तान ही में नहीं बल्कि बहुत से दूसरे देशों में भी लोगों के दिलो-दिमाग पर प्रभूत प्रभाव पड़ा है। उसकी थोड़ी सी झलक उस दिन दिल्ली में नजर आई जबकि लोग लाखों की संख्या में मौलाना को अपनी अन्तिम श्रद्धांजलि अर्पित करने के लिए जमा हुए थे।

हम जब बाज चीजों के अभ्यस्त हो जाते हैं तो यह महसूस करने लगते हैं कि वे हमेशा रहेंगी। इसी तरह अपने साथियों के बारे में भी हमें कुछ ऐसी ही धारणा हो जाती है। लेकिन जब कोई ऐसा व्यक्ति अचानक इस दुनिया से उठ जाता है, तो हम महसूस करते हैं कि उसकी जिन्दगी और उसकी मौत हमारे लिए क्या अर्थ रखती है। मौलाना आजाद उन लोगों में से थे जिनके व्यक्तित्व का उद्भव और विकास राष्ट्रीय आन्दोलन के साथ-साथ आधी शताब्दी से अधिक अवधि में हुआ। उन्होंने राष्ट्रीय आन्दोलन के विभिन्न दौर देखे और उनमें भाग लिया। उसके प्रयास परिश्रम, उसकी सफलताओं और असफलताओं, उसके उद्देश्य की प्राप्ति करने वालों में वह सम्मिलित रहे और वह उस आन्दोलन का महत्वपूर्ण अंग थे। उन्होंने बहुत हद तक इसका निर्माण किया। फिर भी वह एक उद्भट्ट विद्वान और विशिष्टता प्रेमी व्यक्ति रहे। यों कहना चाहिए कि वह बहुत बड़ी संख्या वाले हिन्दुस्तानी अवाम में एक और अकेले अनुपम और बेजोड़ रहे। इस लम्बी अवधि में उन्होंने राष्ट्रीय आन्दोलन को जो नेतृत्व प्रदान किया केवल

इसी कारण से उन्हें हमारे राष्ट्रीय इतिहास में शाश्वत और स्थायी स्थान प्राप्त रहेगा।

इसके अतिरिक्त उनका व्यक्तित्व असाधारण विद्या और आश्चर्यजनक प्रतिभा से युक्त था, परन्तु उस पर कभी भावुकता या पक्षपात का प्रभाव नहीं पड़ता था। सबसे बड़ी बात यह है कि उनका व्यक्तित्व एक ऐसा दर्पण था जिसमें हिन्दुस्तान की रंग-बिरंगी संस्कृति की प्रतिच्छाया पाई जाती थी जिसे बहुत सी विदेशी धाराओं ने प्रभावित और मालामाल किया है।

कुछ मान्यताओं के अनुसार उनकी चिन्तन प्रणाली बुनियादी तौर पर आधुनिक थी और कतिपय दूसरी बातों में उनका भूतकाल से बड़ा गहरा सम्बन्ध था। वह इस युग की बुद्धि और सूझ-बूझ की प्रतिच्छाया थे जिसे प्रगतिशील युग कहा जाता है। कुल मिलाकर वह एक ऐसे असाधारण व्यक्ति (महामानव) थे जिन्होंने इस उद्देश्य को, जिसके लिए वह उम्रभर प्रयत्नशील रहे, एक विशिष्ट गौरव प्रदान किया और वह भी इस ढंग से जिसकी कोई समता नहीं कर सकता। पुरानी व्यवस्था बदलती है और हम उसे वापस नहीं ला सकते, लेकिन हम उससे बहुत कुछ सीख सकते हैं। इसी तरह हम मौलाना आजाद की याद दिलों में ताजा करते हुए उनके जीवन और उनकी शिक्षा से एक बड़ा सबक सीख सकते हैं।

डॉ० राजेन्द्र प्रसाद

मौलाना अबुल कलाम आजाद

फारसी में एक कहावत है "बुजुर्गी ब-अक्ल अस्त न ब-साल, तवंगरी ब-दिल अस्त न ब-माल"—जिसका अर्थ है श्रेष्ठता और महत्ता बुद्धि से उत्पन्न होती है आयु से नहीं, जैसे—उदारता हृदय की विशालता से पैदा होती है न कि सम्पत्ति के स्वामित्व से। हमारे इतिहास में यदि इस सत्य की अभिव्यक्ति कभी हुई तो वह घटना थी मौलाना आजाद का कांग्रेस की केवल दो-तीन वर्षों की सेवा के फलस्वरूप मात्र 38 वर्ष की आयु में कांग्रेस का अध्यक्ष निर्वाचित होना। राष्ट्रीय जागरण और जोश की इस अल्पावधि में उन्होंने न केवल अपनी वाकपटुता में बल्कि बुद्धि की कुशाग्रता, अपने परामर्श की तर्कपूर्णता तथा परस्पर विरोधी दृष्टिकोणों में सामंजस्य कायम करने और मत-भिन्नता में सौहार्द स्थापित करने की क्षमता से भी अपने सहयोगियों और सहकर्मियों पर प्रभूत प्रभाव डाला।

समान रूप से, स्वाभाविक रूप में उनकी बुद्धि, सत्यनिष्ठा और देशभक्ति में यह अटूट विश्वास उस समय भी प्रदर्शित हुआ जब वह फिर 1940 ई० में कांग्रेस के अध्यक्ष निर्वाचित हुए जबकि हिन्दू-मुस्लिम-विवाद विभंग-बिन्दु पर पहुँच रहा था और पृथक स्वतंत्र मुस्लिम राज्य की मांग प्रतिपादित तथा व्यक्त की जा रही थी। वह भारत-ब्रिटिश-संबंधों में समझौते की महत्वपूर्ण अवधि में अध्यक्ष बने रहे जब प्रशासन-हस्तांतरण के लिए अध्यक्ष मौलाना आजाद के माध्यम से, कांग्रेस और ब्रिटिश हुकूमत के प्रतिनिधियों के बीच बातचीत बार-बार होती रही।

मुझे संदेह है कि मौलाना के अतिरिक्त और कोई व्यक्ति कांग्रेस अध्यक्ष के जवाबदेह पद पर उनसे अधिक काल या उनके बराबर अवधि तक कायम

रहे और वह भी ऐसे समय में जब सर्वाधिक संवेदनशील और महत्वपूर्ण प्रश्नों पर बहसें हुईं। कांग्रेस ने उनकी बुद्धि और सत्यनिष्ठा पर पूरा भरोसा किया और वह इस अग्नि परीक्षा की कसौटी पर शुद्ध सोने की भांति खरे उतरे जबकि उनके अधिकांश सहधर्मी उनके विरोध में पंक्तिबद्ध हो गये।

मौलाना आजाद ने इस नश्वर शरीर का परित्याग कर दिया है, किन्तु उनकी विचारधारा हमें और आगे जन्म लेने वाले दूसरों को भी प्रेरित करती रहेगी। काश, हम अपने को इस महत्वपूर्ण विरासत के लिए सक्षम वारिस साबित कर सकें।

———

डॉ० एस० राधाकृष्णन

अन्वेषण और उपलब्धि

मौलाना साहब बड़े साहस, निर्भयता, सत्यनिष्ठा और उत्कृष्ट स्वाधीनता-प्रेम की विशिष्ट प्रतिमा थे । वह लगभग दो पीढ़ियों से हमारे राजनीतिक जीवन में अद्वितीय व्यक्तित्व रहे हैं। 1920 ई० में कांग्रेस में सम्मिलित होने के पूर्व भी वह एक क्रान्तिकारी थे । उनका राजनीतिक विवेक, देशभक्ति पूर्ण उत्साह और त्यागपूर्ण सेवा प्रारम्भ में ही मान्यता प्राप्त हो चुकी थी, जिससे कि 1923 ई० में वह भारतीय राष्ट्रीय कांग्रेस के अध्यक्ष बनाये गये जिस पद पर वह अनेक वर्षों तक विभिन्न संकटकालीन अवसरों पर आसीन रहे । एक दूरदर्शी राजनेता, एक उत्साही देशभक्त और एक महान बुद्धिजीवी के रूप में देश के प्रति उनकी सेवाएँ अपरिमेय रही हैं। उन्होंने अपनी दृढ़ धारणाओं के लिए दुःख झेले, किन्तु अपने विचारों को व्यक्त करने में कभी पीछे नहीं हटे । नेतृत्व के महान गुणों में एक गुण उनमें यह था कि अपनी लोकप्रियता खोने के भय से वह अपने विचारों को व्यक्त करने में कभी नहीं कतराये, नहीं झिझके । एक नेता को दृढ़ रहना है । वह आदमी कभी नेता नहीं हो सकता जो अपने विचारों के लिए अलोकप्रियता का जोखिम नहीं उठाता । वह आदमी जो सबको खुश करना चाहता है वह अन्तोगत्वा किसी को खुश नही कर सकता ।

पराधीनता के लिए हमारे दोषों और त्रुटियों पर मौलाना आजाद की नजर पड़ी और अपनी शक्ति भर उन्हें दूर करने के लिए लड़े । प्रायः राष्ट्रीय मतभेदों के कारण हमें पराधीनता और बार-बार अनादर का मुँह देखना पड़ता रहा है । वह उनके विरोध में अडिग रहे, उन्होंने देश का दृढ़ीकरण सम्पन्न करना चाहा । वह एक धर्मपरायण मुसलमान थे जिनका कुरान संबंधी किया हुआ कार्य एक गौरव ग्रन्थ बन गया है । वह हमेशा राष्ट्रीय एकता

और साम्प्रदायिक सद्भाव कायम करने में दृढ़ रहे। उन्होंने हिन्दू और मुस्लिम, सिख और ईसाई में भेद नहीं किया। उन्हें एहसास था कि वे सब, जो इस देश में हैं, एक देश के वासी हैं। राष्ट्रीय चेतना उनके जीवन की प्रेरक शक्ति थी। वह राष्ट्रीय एकता और साम्प्रदायिक सद्भाव के संदेशवाहक थे, यह पाठ हमें भी याद रखना चाहिए, क्योंकि ऐसी शक्तियाँ आज भी इस देश में मौजूद हैं, जो हमें एक दूसरे से अलग करने का कार्य कर रही हैं। भारतीय एकता को निश्चित समझते हुए कान में तेल डालकर सो नहीं जाना चाहिए। भाषाई और क्षेत्रीय मतभेदों के इन दिनों में इस एकता को बड़ी सावधानी से विकसित करना है। इन मतभेदों को भरतीय एकता को दृढ़ करने में होशियारी के साथ इस्तेमाल करना चाहिए।

जहाँ एक ओर उनकी हार्दिक मानवता सर्वविदित थी वहाँ दूसरी ओर सार्वजनिक कार्यों में क्या सही है और क्या गलत है इसका उनको स्पष्ट ज्ञान था। जहाँ एक तरफ व्यक्तिगत सम्बन्धों में उनके व्यवहार पर संवेदना या सहानुभूति का प्रभाव पड़ता था वहाँ दूसरी तरफ सार्वजनिक कार्यों में न्याय के सिद्धान्तों से कभी भी विचलित नहीं होते थे। यदि कोई व्यक्तिगत रूप में उनका अनादर करता था तो उसे वह क्षमा कर सकते थे, मगर जब कोई देश को क्षति पहुँचाता था तो उससे बड़ी कड़ाई के साथ निपटते थे। व्यक्तिगत सम्बन्धों में सहानुभूति और सार्वजनिक कार्यों में न्याय ही उनका सिद्धान्त था। यदि हम प्रशासन में सत्य-निष्ठा की उपेक्षा करें, तो सरकार का स्थायित्व और हमारे समाज के ढाँचे की दृढ़ता कमजोर हो जाएगी। उचित और अनुचित को तरजीह देने के अधिकार के वह बड़े प्रेमी थे। जब कभी प्रशासनिक सत्यनिष्ठा या न्यायनिष्ठा के प्रश्न उठे वह हमेशा जन-प्रशासन के उच्च स्तर को बनाये रखने के लिए लड़े। यह दूसरा पाठ है जिसे हमें याद रखना है।

जब एक बार स्वतंत्रता प्राप्त कर ली गई तो उन्होंने फिर सोचा कि उस आजादी को हमें समाज-कल्याण के उन्नयन के लिए अवश्य इस्तेमाल करना चाहिए, इस देश को रोगों, गंदगियों, निरक्षरता आदि से छुटकारा दिलाना और हम अपने दिमागों को अंधविश्वास, रूढ़िवाद और धर्मान्धता से मुक्त कर दें। वह मुक्त मस्तिष्क के कट्टर समर्थक थे, ऐसा मस्तिष्क जो नस्ल, या भाषा, प्रान्त या बोली, सम्प्रदाय या जाति के संकीर्ण पूर्वाग्रहों से मुक्त हो। हमें मौलाना साहब में ऐसा ही सुसंस्कृत मस्तिष्क प्राप्त था।

जब कभी मैं उनसे बात करने गया, उनकी बातें अरबी और फारसी के उद्धरणों से पूर्ण होती थीं। मैं नहीं जानता, किन्तु मुझे बताया गया कि इन भाषाओं पर उनका आपार अधिकार था और उनके भाषण, जो वह उर्दू में देते थे, दृढ़ संरचनायुक्त परिष्कृत और ओजस्वी शैली में अपने लक्ष्यों में निश्चयात्मक तथा सारगर्भित होते थे।

हम याद रखें कि उन्होंने राष्ट्रीय एकता, प्रशासन में सत्यनिष्ठा या न्याय-निष्ठा और आर्थिक प्रगति के आदर्शों के लिए काम किया। यह बड़ी चीजें हैं जो उद्देश्यस्वरुप हमने अपने सामने रखी है। उनके संस्मरण को सम्मान प्रदान करने का हमारे लिए केवल एक ही मार्ग है कि हम उनके आदर्शों को अपना लें और प्रतिदिन अपने से प्रश्न करें कि क्या हम अपने कार्यों के द्वारा राष्ट्रीय एकता को दृढ़तर कर रहे हैं, इस प्रशासन में सत्यनिष्ठा को प्रोत्साहित कर रहे हैं और आर्थिक तथा भौतिक प्रगति को तीव्रतर कर रहे हैं। वही रास्ता है जिसपर अग्रसर होकर हम उनके जीवन के पाठों को हृदयंगम कर सकते हैं।

पुस्तकें निरंतर और अविरत उनकी सहचरी रही हैं। उनका वार्तालाप अरबी और फारसी के गौरवग्रंथों के उदाहरणों से परिपूर्ण रहता था। उन्होंने पूर्वी एवं पश्चिमी दर्शन का इतिहास शीर्षक पुस्तक की प्रस्तावना लिखी, जिसका आरम्भ फारसी के एक शेर से हुआ जिसमें सृष्टि की तुलना एक पुरानी पांडुलिपि से की गई जिसके प्रथम और अन्तिम पृष्ठ खो गये हैं। अब तो न यह कहना सम्भव है कि पुस्तक (सृष्टि) कैसे प्रारम्भ हुई और न हम यह जानते हैं कि इसका अन्त किस प्रकार होगा।

अव्यक्तादिनि भूतानि व्यक्तमध्यानि भारतः।
अव्यक्तनिध्नान्येवः तत्र का परिवेदना॥

(हे अर्जुन,) सम्पूर्ण प्राणी जन्म से पहले बिना शरीरवाले (और) मरने के बाद भी बिना शरीरवाले ही हैं, (केवल) बीच में ही शरीरवाले (प्रतीत होते) हैं, (फिर) उस विषय में क्या चिन्ता हैं।

जीवन और अस्तित्व के अर्थ का पता लगाना दार्शनिक अन्वेषण का लक्ष्य है। हमें इसके पता लगाने में सफलता नहीं भी मिल सकती है, लेकिन

इस अन्वेषण का अनुधावन या अनुसरण अपना प्रतिफल आप है। वह प्रस्तावना का अंत फारसी के दूसरे शेर से करते हैं जिसका अर्थ है कि वे जो इस मार्ग का अनुसरण करते हैं वे कभी नहीं थकते, क्योंकि यह मार्ग और लक्ष्य दोनों हैं। उनका जीवन इसका उदाहरण है। वह अन्वेषण और उपलब्धि दोनों था।

निस्संदेह उनके सदृश महापुरूष हम फिर नहीं देखेंगे। गरिमामय व्यक्तित्व, अदम्य पराक्रम और निर्भय आचरण। ये थे हमारे मौलाना साहब।

डॉ० जाकिर हुसैन

एक सर्वतोमुखी व्यक्तित्व

राष्ट्रपति जी, भाइयों और बहनों, आप जानते हैं कि हम आज यहाँ क्यों जमा हैं। अब तक आपके सामने जो कुछ कहा गया वह मौलाना के साथियों का हृदयोद्गार था। मुझे मौलाना के साथी होने का गौरव प्राप्त नहीं है। किन्तु मुझे उनका तुच्छ शिष्य होने का गर्व जरूर है। आदमी छोटा हो या बड़ा अपना जीवन जीने के लिए कहीं-न-कहीं से प्रकाश और उर्जा प्राप्त करता है। मैं जब एक लड़का ही था, अपने जीवन के मिट्टी के दीप को जलाना चाहता था। और लोगों की भाँति मैंने भी रूई की बत्तियाँ बनाई थीं और अपने जीवन के तेल में उनको डाला था और ढूंढ़ता फिरता था उनको कहाँ से जलाऊँ। इस जिन्दगी की पहली बत्ती, इस दीप की पहली बत्ती मौलाना के दीये से जलाई थी। एक छात्र की हैसियत से मैं उनका "अल-हिलाल" पढ़ता था और जब मैं अपने साथियों में बैठकर उसको पढ़ता था और उन्हें सुनाता था उस समय उस बत्ती में आग लगी थी। यों और जगह से भी मैंने आग ली। लेकिन आज मैं स्वीकार करता हूँ कि पहली आग उन्हीं से ली थी। मैं उनसे दूर-दूर रहता था, इसलिए कि मैं राजनीति का आदमी नहीं हूँ। सर्वदा उनकी संगति का अवसर मुझे नहीं था, किन्तु कभी-कभी उनसे मिलता था और जब मिलता था तो उनसे प्रकाश और उष्णता प्राप्त करता था। अभी साल भर से कम की ही बात है किसी विषय पर मुझे उनसे कुछ दुःख हुआ और मैं उनसे कुछ खिंचा। इस समय मैं आपके सामने स्वीकार करता हूँ कि मैंने अपनी बुद्धि की कमी से इस खिंचाव को उनके समक्ष व्यक्त भी किया, मगर उसपर बिगड़ने और मेरी गुस्ताखी समझने के बजाए मुझे अपने स्नेह से मालामाल किया। और जब उनके बुलाने पर उनसे मिलने गया तो मैं शर्म से गड़ा जाता था और

वह स्नेह की बौछार करते जाते थे और मेरे उपर प्यार की ऐसी वर्षा हो रही थी कि मैं उसको कभी भुला न सकूँगा। मौलाना बहुत से आयाम रखने वाले व्यक्ति थे। वह उद्भट विद्वान थे धर्म के, धुरंधर विद्वान थे साहित्य के। साहित्य पर उनकी दृष्टि बड़ी विलक्षण थी। उनकी अभिरुचि उच्च कोटि की थी। वह पुस्तकों के प्रेमी थे। और कोई राजनेता यह न समझे कि उन्होंने राजनीति के चलते अपने विद्या प्रेम को कभी भी त्यागा हो, वह अंतिम क्षण तक उसके साथ वफादार रहे। हाँ वह जानते थे कि विद्या एक बोझ भी बन सकती है, विद्या एक ऐसा भार बन सकती है जो आदमी को दबावे और निकम्मा बना दे। वह विद्या के साथ सामाजिक उत्तरदायित्वों को भी समझते थे। वह देश के प्रति अपने कर्तव्यों को भी जानते थे। उन्होंने अन्तिम समय तक विद्या को नहीं छोड़ा और विद्या की लगन उनके दिल में लगी रही। पुस्तकों की खोज, चीजों पर चिन्तन-मनन, उनको सोचना, उनको समझना, उनका जोड़ मिलाना, चाहे वे ऐतिहासिक समस्याएँ हो, चाहे वे साहित्यिक समस्याएँ हो, चाहे वे विद्या-संबंधी समस्याएँ। उनकी सूझ-बूझ अंतिम समय तक शेष रही। अभी अन्तिम बार दिसम्बर में जब मैं उनसे मिला वह दो किताबें देखना चाहते थे। इन किताबों को देखने के लिए पटना आने की इच्छा प्रकट की उन्होंने कहा कि गौहाटी की यात्रा के क्रम में पटने आऊँगा और उन दोनों पुस्तकों को देखूँगा। अफसोस की बात है कि उसका अवसर उनको न मिल सका। बीमारी के कारण न वह कांग्रेस में गये और न इसके लिए पटने गये, लेकिन उनकी यह लगन अंतिम समय तक रही। किन्तु कोई यह न समझे कि वह ऐसे विद्वान थे जो विद्या के बहाने से अपने सभी सामाजिक कर्तव्यों से अलग हो जाते और उनका ख्याल न करते। उन्होंने अपने उदाहरण से प्रमाणित कर दिया कि वह अपना सारा जीवन एक स्वतंत्रता-सेनानी की भाँति स्वतंत्रता-संग्राम में और स्वाधीनता-प्राप्ति के पश्चात् आजादी को अच्छी नींव और बुनियाद पर स्थापित करने के लिए लगा सकते हैं। उन्होंने यह साबित कर दिया कि विद्या एक गोरखधंधा नहीं है कि जिससे लोगों को धोखे दिये जाएँ बल्कि वह एक प्रकाश है जिससे आदमी दूसरे को रोशनी दिखा सकता है जानने वाले जानते हैं कि उस विद्वान, उस चिन्तक, उस वीर पुरुष ने उचित बात बोलने, सच्ची बात कहने, कटु सत्य कहने के उदाहरण प्रस्तुत किये हैं सच बात का कहना सबसे बड़ा जेहाद है। सच बात

कहने में बड़ी कटुताएँ हैं। लोग अप्रसन्न होते हैं और मौलाना से क्या लोग अप्रसन्न नहीं हुए; यहाँ मुसलमान भाई होंगे। हम सोचें कि हमने मौलाना का किस किस तरह दिल नहीं दुखाया। हमने मौलाना को क्या कुछ नहीं कहा। कौन-सा अपशब्द है जो हमने उनके लिए व्यवहार नहीं किया, लेकिन उस शान्तचित्त महामानव ने कभी एक शब्द कहा किसी के सम्बन्ध में; कोई है यहाँ जो साक्ष्य दे सकता है कि उसने कभी किसी के बारे में कोई ऐसी बात सुनी कि उन्होंने निन्दा की हो या बुरा माना हो ? सब कुछ गुजर जाता था और उसकी वह बिल्कुल परवाह नहीं करते थे । वह सत्य बात जरूर कहते थे। राय लीजिए, तो सही राय देते थे। जैसा कि अभी कहा गया वह एकान्तप्रिय थे। कुछ दिनों से वह लोगों से कम मिलने लगे थे। लोगों से कम मिलने के बावजूद वह सबके साथी थे। वह उस कमरे में बैठकर हमारे सब के साथी थे, और इस तरह साथी कि हमें महसूस होता था कि वह हमारे साथी हैं। इसलिए कि जब वह बात कहने की जरूरत होती थी जो हम चाहते हैं कि की जाए और जो हम समझते हैं कि हम नहीं कह रहे हैं और हमारी तरफ से वह बात नहीं की जा रही है। वह उसको कहते थे और हमें विश्वास था कि वह उसको कह सकते हैं और एक वीर पुरुष के लिए यह बहुत बड़ा और उच्च दर्जा है। इन सब में हमारे वास्ते बहुत बड़ी शिक्षाएँ हैं। इन सब में हमारे वास्ते बहुत बड़े सबक है। जैसा मैंने कहा चूँकि मैं एक छात्र की भाँति पाठ पढ़ने के लिए ही उनके पास गया था, आज भी यह समझता हूँ कि वह पाठ जारी है। यद्यपि वह हमारे बीच नहीं रहे, जैसा कि राष्ट्रपति जी ने कहा कि वह लेखनी जिससे मोती बरसते थे, वह लेखनी जिससे बिजलियाँ भी गिरती थीं, वह भाषा जिससे फूल झड़ते थे और जिससे चिंगारियाँ भी बरसती थीं जो मिथ्या को जलाती भी थीं और सत्य को प्रकाशित भी करती थीं। वह भाषा बन्द है, वह लेखनी टूट गई है, लेकिन वह उदाहरण विद्यमान है और हमें चाहिए कि उस उदाहरण से गर्मी भी प्राप्त करें और अपने जीवन को ऐसा बनाएँ जैसा कि वह चाहते थे कि हम बनाएँ और जिसका उदाहरण वह हमारे लिए छोड़ गये। हमारे सामने एक बहुत बड़ा काम है। इस राष्ट्र के निर्माण का कार्य कोई खेल नहीं है।

बस्ती बसना खेल नहीं है, बसते-बसते बसती है।

कोई यह न समझे कि हथेली के ऊपर सरसो जम सकती है। इसमें न

मालूम कितने अबुल कलाम खप जाएँगे, कितनी नस्लें खप जाएँगी और यह काम कभी नहीं समाप्त होने वाला काम है।

इसलिए हमें अपने सामने उस रास्ते को रखना चाहिए। उन उदाहरणों को जीवित रखना चाहिए। वे इस प्रकार जीवित रह सकते हैं, कि हम वे सब काम करें जो मौलाना आजाद करते रहे और कोई यह नहीं समझे कि हमें वह नहीं कर सकते हैं जो वह करते थे। किसी का स्थान पूरणीय नहीं है। बहुत बड़े-बड़े लोग गुजर गए। जैसा कि किसी ने अभी हाल में कहा था कि कभी ऐसा हाता है कि आकाश पर बहुत से तारे एक साथ आ जाते हैं। हमारे राष्ट्ररूपी आकाश पर भी बहुत से तारे एक साथ आ गये थे। वे एक-एक कर टूटते जाते हैं। किन्तु इसकी चिन्ता नहीं करनी चाहिए, इसलिए कि चिन्ता कर कुछ हो नहीं सकता। उनका जाना जरूरी है, यह सत्य है। कोई उनको वापस नहीं ला सकता। हमारा कर्त्तव्य यह है कि हम अपने जीवन में किसी उपाय से उन कार्यों को पूर्ण करने का प्रयास करें। जो एक आदमी करता था उन्हें एक हजार आदमी मिलकर करें। किन्तु अपने जीवन की दिशा वहीं रखें, सच्चाई की तरफ रखें, कर्त्तव्य की तरफ रखें, विद्या की तरफ रखें। एक दूसरे को समझने की कोशिश करें और यह जानें कि हमारे ऊपर जो कर्त्तव्य हैं वे पूरी तरह निष्ठापूर्वक किये जाने की माँग करते हैं। यह कर्त्तव्य कभी पूरे नहीं होते।

मेरे विचार से मौलाना ने जो एक सबसे बड़ी सेवा की वह यह है कि हर धर्म के आदमी को उन्होंने यह बताया कि धर्म के दो रूप होते हैं। धर्म का एक रूप वह है जो भेद-भाव पैदा करता है, लोगों को अलग-अलग करता है, जो लोगों में घृणा उत्पन्न करता है, वह धर्म झूठा है। उन्होंने यह बताया कि धर्म की आत्मा मिलाने वाली, जोड़ने वाली आत्मा है, वह आत्मा एक दूसरे को पहचानने वाली है। धर्म की आत्मा सेवा की आत्मा है। धर्म की आत्मा दूसरों के लिए अपने को मिटाने की आत्मा है। धर्म की आत्मा सारे जीवन की एकता में आस्था रखने की आत्मा है। यह एक ऐसा पाठ है जो सभी धार्मिक वर्गों और उन सब लोगों को सीखना चाहिए जो छोटी-छोटी टुकड़ियाँ बनाना चाहते हैं। भाषा के नाम पर, या राज्य के नाम पर, किसी जात-पात के नाम पर या किसी धर्म के नाम पर टुकड़िया बनाकर हमारे

जीवन के एकत्व नष्ट करना चाहते हैं। हमारे देश में इस समय जो सब से बड़ा रोग है वह यह है कि हमारे पास जो छोटी वफादारियाँ हैं, संकीर्ण वफादारियाँ हैं, वे अधिक शक्तिशाली है। हम छोटे-छोटे गिरोहों से ज्यादा संबद्ध है और बड़े गिरोह को पुर्णरूपेण नहीं समझते हैं। हमको चाहिए कि अपनी छोटी वफादारियों को इस बड़ी वफादारी के अधीन कर दें। यह कोई आवश्यक नहीं है कि छोटी वफादारियाँ तोड़ दी जाएँ। किसी को यह जरूरी नहीं है कि वह सिख न रहे, मुसलमान न रहे, हिन्दू न रहे या पारसी न रहे। किन्तु उसे पहले अपने देश का फिर समग्र मानवता का सेवक बनना चाहिए। तब वह सच्चा मुसलमान है, तब वह सच्चा हिन्दू है, तब वह सच्चा ईसाई है, तब वह सच्चा पारसी है, तब वह सच्चा सिख है। यह पाठ मौलाना की जीवनी से जिस रौशन रूप में हमें मिलता है और यह सबक जिस प्रकार हमारे लिए आज के जीवन में और हमारे राष्ट्रीय जीवन में आवश्यक है, उस दृष्टि से हम समझते हैं कि आज का दिन हमारे लिए यह प्रतिज्ञा करने का दिन है कि हम इस आत्मा को, धर्म की सच्ची आत्मा को अपने राष्ट्रीय जीवन में कार्यान्वित करें।*

□

---

*यह भाषण डा० जाकिर हुसैन साहब ने दिल्ली की उस शोक सभा में दिया था जो राष्ट्रपति डा० राजेन्द्र प्रसाद की अध्यक्षता में 23 फरवरी, 1958 ई० को आयोजित की गई थी।

महादेव देसाई

व्यक्तित्व

मौलाना अबुल कलाम आजाद के बुलन्द और शानदार व्यक्तित्व को देख कर हकीम अजमल खाँ और डाक्टर अन्सारी ऐसे महान व्यक्तियों की याद ताजा हो जाती है, जो इस्लामी संस्कृति के धारक थे। मौलाना की आँखों से रोब, बुजुर्गी और प्रतिभा टपकती थी । मौलाना के व्यक्तित्व में ऐसा आकर्षण है कि आपका हर जगह सम्मान किया जाता है। किन्तु आप उन नेताओं में से नहीं जिन तक तुरंत पहुँच हो जाती है जो हर आदमी से मिलते हैं और ख्याति प्राप्त करते हैं।

आपकी महत्ता विद्वत्ता और गहरे अध्ययन ने आपकी तबीयत की प्रवृत्ति चिन्तन-मनन की ओर कर दी है। इसलिए आपके लिए यह सम्भव नहीं है कि वह आम लोगों में जाकर मिलें जुलें। इसका कारण यह बिल्कुल नहीं है कि अवाम के लिए उनके हृदय में सहानुभूति नहीं है। अभी उस रोज आप खादी पहनने का मतलब बता रहे थे और मेरी इच्छा थी कि इस विषय पर आप घंटों बोलते रहें। आपने फरमाया कि स्वराज्य उस समय तक निरर्थक चीज है जब तक यह गरीब और अमीर के अन्तर को नहीं मिटाता, और मेरे विचार में खादी का आम व्यवहार ही यह अनुभूति उत्पन्न कर देता है कि हम भी इन लाखों गरीब भाइयों में से हैं जो इस देश में बसते हैं। क्या हमारी यह इच्छा नहीं कि हमारे ये बदनसीब भाई हमारे कंधे से कंधा मिलाकर स्वतंत्रता-संग्राम में भाग लें और स्वतंत्रता-प्राप्ति से आनन्दविभोर हों। क्या आप चाहते हैं कि इनमें भी आपकी तरह जागृति पैदा हो। यदि आप यह चाहते हैं तो उसका तरीका खादी का आम व्यवहार है।

मौलाना को अपनी मजबूरियों का ज्ञान है, और बहुत कम नेता ऐसे हैं जिन्हें इसकी अनुभति हो। प्रतिभा की दृष्टि से मौलाना कांग्रेस में बेजोड़ हैं, उनके समान कोई नहीं। प्राय: समस्याओं और नीतियों की व्याख्या इस तरह से करते हैं कि आदमी चकित रह जाता है।

कांग्रेस में मौलाना से बढ़कर और कोई अनुभवी राजनेता और राजनीतिक जोड़-तोड़ करने वाला व्यक्ति नहीं। एक बार आप एक स्थान स्वीकार कर लें तो फिर उसके सभी पहलुओं की स्पष्ट रूप में इस प्रकार बयान करते हैं कि इस समस्या का कोई विन्दु बाकी नहीं रहता। यही कारण है कि गाँधीजी राजनीतिक जीवन के खतरनाक मोड़ पर हमेशा मौलाना की तरफ दृष्टि दौड़ाते हैं।

एक बार मैंने मौलाना से दरयाफ्त किया कि आपकी गाँधीजी से सम्बद्धता का क्या कारण है, उन्होंने जवाब दिया कि गाँधीजी की प्रतिभा के अतिरिक्त उनकी कलंकरहित सत्यता ने उनकी ओर मुझे प्रवृत्त किया। लेकिन 1926 ई. तक मैं हर चीज को आलोचनात्मक दृष्टि से देखता रहा। उसके बाद "यंग इंडिया" में गाँधीजी का एक लेख मेरी नजर से गुजरा जिसमें उन्होंने अपनी पत्नी की एक साधारण-सी त्रुटि पर अत्यधिक पकड़ की थी। वह आश्रम में एक राशि जमा कराना भूल गई थीं। इसपर मुझे ख्याल हुआ कि यह एक ऐसा व्यक्ति है जिसकी सच्चाई उसके शत्रुओं को भी स्वीकार्य होनी चाहिए।

कांग्रेस के मामले में मौलाना की हैसियत हमेशा अनुपम और अद्वीतिय रही है। उन्हें वर्षों से यही हैसियत प्राप्त है और रहेगी। मगर इसके बावजूद आप हमेशा इस प्रकार के पद स्वीकार करने से भागते थे। आप चाहते तो किसी प्रान्तीय असेम्बली या केन्द्रीय असेम्बली में पार्टी लीडर बन सकते थे। मगर आप साफ बचकर निकल जाते रहे। स्वर्गीय सी० आर० दास और पंडित मोतीलाल नेहरू आपकी राय के बिना कदम न उठाते थे। मगर आपने हमेशा प्रदर्शन और हंगामे की जगह परामर्शदाता होने को प्राथमिकता दी।

मौलाना पुस्तकों की संगति तथा विद्या-ज्ञान संबंधी व्यस्तता को बहुत पसंद करते हैं। स्वर्गीय लोकमान्य तिलक अक्सर कहते थे कि मेरा वह

समय जो देश-सेवा में लगा, मुझे विद्या-ज्ञान संबंधी कामों में लगाना चाहिए था। यदि वह ऐसा करते तो हमारे पास अत्यन्त ही बहुमूल्य रचनाओं का भंडार होता जैसी रचना "गीता-रहस्य" है। यही दशा मौलाना की है। बहुत कम लोगों को मालूम है कि मौलाना बहुत बड़े भाषाशास्त्री थे। वह तो भाषा-शास्त्र में अपना सादेश्य नहीं रखते। जब सुबह के नाश्ते के लिए बैठते हैं तो भारतीय भाषाओं के पर्यायवाची और समानार्थी शब्द पूछते हैं। एक बार मैंने गुजराती का एक साधारण शब्द व्यवहार किय जिसका अर्थ बाद में "लिखा हुआ" था। इससे मौलाना के चेहरे पर हर्ष की लहर दौड़ गई। आपने बताया कि यह शब्द फारसी के दो शब्दों से बना है और गुजराती में आकर उसने यह रूप धारण किया है। अरबी और फारसी के ज्ञाता महानुभावों को इसका ज्ञान नहीं है।

कांग्रेस कार्यसमिति की बैठक के बाद अक्सर सदस्य-गण परस्पर वार्तालाप करते हैं। सारे दिन शुष्क राजनीतिक वाद-विवाद के पश्चात् मनोरंजन के यही कुछ क्षण प्राप्त होते हैं। कार्य समिति के इन सदस्यों की बेहद इच्छा होती है कि मौलाना ऐसे अवसरों पर कुछ कहें। अतएव मौलाना विभिन्न देशों के विभिन्न युगों में व्यवहार योग्य पदार्थ की चर्चा छेड़ देते हैं। कभी भोजनों की तिथियों पर प्रकाश डालते हैं और कभी विभिन्न देशों के भोज्य पदार्थ की तुलना शुरू कर देते हैं। इससे उपस्थित सज्जन आनन्दित होते हैं। एक बार आपने फरमाया, "तामिल के लोग" तमरीन्द खाने के बड़े प्रेमी हैं, मगर आपको इस शब्द के श्रोत का ज्ञान नहीं। स्पेन में इसे तमरीन्द्र कहते हैं, और स्पेन वालों ने यह शब्द अरबी से लिया। अरबी में यह शब्द "समरहिन्द" है। समर का अर्थ फल और हिन्द के मानी हिन्दुस्तान है। हिन्दुस्तान में खजूरें नहीं थी, और यह फल खजूरों सदृश था। इसलिए अरबों ने इसे हिन्दुस्तान की खजूर कहना शुरू किया। किसी व्यक्ति ने "मजहब" शब्द का व्यवहार किया तो तुरंत "मजहब" और "दीन" में अंतर बताना आरंभ किया कि हम साधारणतः मजहब शब्द का प्रयोग करते हैं हालांकि अरबी में "दीन" शब्द है। मजहब का अर्थ रास्ता और सड़क है तथा दीन का अर्थ सिद्धान्त, कर्त्तव्य और कानून है। आपने फरमाया कि संस्कृत का शब्द "सन्यास" है जिसका अर्थ संसार त्याग कर बनों में जाता है। "सन्यास" फारसी से "ससान" बन गया है। ईरान

में "ससान्दू" एक खान्दान है, क्योंकि इनका पहला बादशाह गद्दी पर बैठने से पहले जंगलों में फकीर की तरह जीवन व्यतीत करता था।

मौलाना बहुत बड़े पूर्व-विद् हैं। अरबी और फारसी में तो कोई भी उस टक्कर का नहीं। किन्तु जब वह उर्दू में वार्तालाप करते हैं, तो ऐसी आसान, सरल, और चलती भाषा बोलते हैं कि हर आदमी भलीभांति समझ सकता है। बेशक मौलाना की यही जबान हिन्दुस्तानी भाषा है और गांधीजी इसी भाषा को हिन्दुस्तान का लिंग्वाफ्रैंका समझते हैं। मौलाना अपने वार्तालाप में उदाहरणों और रूपकों का प्रयोग करते हैं, और इस प्रकार उनका अभिप्राय श्रोता के मस्तिस्क पटल पर अंकित हो जाता है। 1936 ई० में मैं उनसे बातें कर रहा था कि किसी ने हमारे सर्वसाधारण की श्रद्धा और कांग्रेस में विश्वास का जिक्र किया। मैंने कहा कि केवल इस श्रद्धा और विश्वास के कारण ही हमारे अक्सर आन्दोलन सफल रहे हैं। मौलाना ने इसकी पुष्टि करते हुए कहा कि हाँ, श्रद्धा से ऐसा हुआ है और इससे भी ज्यादा हो सकता है। मजहब (धर्म) में असीम शक्ति है जिसका अन्दाजा नहीं लगाया जा सकता। बैलगाड़ी का गाड़ीबान अगर बेवकूफ हो तो उसका नतीजा गाड़ीबान या एक-दो और आदमियों को नुकसान पहुँचने के रूप में निकलेगा। लेकिन जब रेलगाड़ियाँ टकरा जाएँ तो सैकड़ों जाने चली जाती हैं और बेअंदाजा नुकसान। मजहब भी एक शक्तिशाली स्टीम इंजन की तरह है। इसका चालक बहुत चतुर और बुद्धिमान आदमी होना चाहिए। किसी अनुचित व्यक्ति के कारण बेहद नुकसान हो सकता है। यह हमारा दुर्भाग्य है कि मजहब की बागडोर अयोग्य लोगों के हाथ में है, उन्होंने इसे बेमजहबी और अधार्मिकता में परिवर्तित कय दिया है। हमें कुछ मालूम नहीं कि हम किधर जा रहे हैं। काश, मैं यह चीज मौलाना के शब्दों में बयान कर सकता।

यद्यपि आप अंग्रेजी बहुत कम बोलते हैं, मगर आपका पुस्तकालय अंग्रेजी और फ्रांसीसी पुस्तकों से भरा हुआ है। आपने कई अंग्रेजी कवियों का अध्ययन किया है। उदाहरणार्थ, शेक्सपियर, वर्डसवर्थ, शैली वगैरह। मगर आप बायरन को बहुत पसन्द करते हैं। इसका कारण यह है कि वह यूनान के स्वाधीनता-संग्राम में लड़ते हुए मारा गया, और जिसने विचार एवं कर्म की स्वाधीनता की शिक्षा दी है। उसने क्रान्तिकारी राजनीति में स्वयं उल्लेखनीय भाग लिया।

आपके पुस्तकालय में बड़े-बड़े मनीषियों की रचनाएँ हैं, जिनमें गेटे, स्पोनोजा, रूसो, मार्क्स, ह्यूलाक एलिस उल्लेखनीय हैं। आपके पास वेद और उपनिषद की सभी जिल्दें मौजूद हैं। इतिहास, साहित्य, दर्शन, और धार्मिक पुस्तकों की गणना करना कठिन है। आप खास-खास उपन्यासों को भी पसन्द करते हैं। डयूमाज और ह्यूगो को बहुत दिलचस्पी से पढ़ते हैं। विशेषकर फ्रांसीसी क्रान्ति से सम्बद्ध कोई-न-कोई उपन्यास आप सफर में अपने साथ अवश्य रखते हैं। टॉल्सटाय और रस्किन को आपने बार-बार पढ़ा है। इतिहास और दर्शन की किताबें तो आपकी स्थायी सहचर हैं। एक बार रेल में सफर में मैंने उनके पास न्याय विशेषिका, दर्शन की किताब देखी। इस व्यस्त जीवन में कभी-कभी मादाम जेन पोमपाडोर पढ़कर भी आनन्दित होते हैं। आपकी मेज पर हजरत मोहम्मद और हजरत उमर पर नवीनतम प्रकाशित पुस्तकें थीं। अन्य किताबों में फ्लाबर्ट की किताबें भी हैं जिनमें मादाम बवारी भी मौजूद हैं।

आपके पास अरबी, फारसी और तुर्की की असंख्य किताबें हैं जिसके नामों से हमारे देश के अक्सर विद्वान और साहित्यिक भी अनभिज्ञ होंगे।

बाहरी दुनिया से आप पत्र-व्यवहार के द्वारा सम्पर्क कायम रखते हैं। स्वर्गीय जागलोल पाशा और फतही बे से आपका पत्र-व्यवहार होता था। अन्तिम चर्चित व्यक्ति तो आपके अत्यन्त प्रिय मित्र थे। कमाल अतातुर्क और तुर्की के महान नेताओं से आपका सम्बन्ध बहुत गहरा था। तुर्की की नौजवान पार्टी के नेता, जिन्होंने 1908 ई० की क्रान्ति की थी, आपके व्यक्तिगत मित्र थे। यह पार्टी प्रथम महायुद्ध तक शासन में रही। तुर्की के ससदाध्यक्ष अहमद रजा, डाक्टर सलाहउद्दीन, अनवर पाशा और जावेद बे से आपका मित्रतापूर्ण पत्र-व्यवहार रहा है। इस तरह ईरान का प्रसिद्ध क्रांतिकारी तकीजादे आपका बहुत प्रिय मित्र था।

अत्यधिक अध्ययन तथा पुस्तकों में तल्लीनता ने आपको एकान्तप्रिय और एकान्तवासी बना दिया है। यद्यपि आप स्नेही और मिलनसार हैं, तथापि आपके मित्रों की संख्या बहुत कम है। यद्यपि आप सर्वोत्तम वक्ता हैं, तथापि प्रायः चुप रहते हैं। इसी आदत के कारण इसके अतिरिक्त हमें कुछ विशेष जानकारी नहीं है कि आप चाय और सिगरेट लगातार पीते हैं।

मौलाना बिल्कुल सादा जीवन व्यतीत करते हैं। आपके ड्राइंग रूम और कार्यालय में पुस्तकों के अतिरिक्त कोई चीज दिखाई नहीं देती, कमरे में कोई फोटो वगैरह नहीं। एक बार मैंने उनके सिगरेटों के सम्बन्ध में दरयाफ्त किया, मौलाना ने मेरे इस प्रश्न पर अपनी एक घटना का वर्णन करते हुए कहा—जब मैं 1921 में गिरफ्तार होकर अलीपुर जेल पहुँचाया गया तो मेरे पास केवल दस सिगरेट थे। जेल में मैंने दो सिगरेट पिए और शेष जेल के दरोगा के हवाले कर दिये। सी० आर० दास ने मुझे रोका कि जेल में तुम्हें इनकी जरूरत पड़ेगी। मगर मैंने जवाब दिया कि रिहाई से पहले मुझे इनकी जरूरत नहीं। अतएव कुछ दिनों के बाद मुझे ऐसा महसूस होने लगा कि मैंने कभी सिगरेट पिए ही नहीं।

मौलाना इस आदत की दृष्टि से पंडित मोतीलाल नेहरू के सदृश है, जिनका यह कहना था कि मुझे जीवन की सर्वोत्तम वस्तुओं से प्रेम अवश्य है, लेकिन मैं उनको बिना किसी कष्ट के त्याग भी सकता हूँ। अतएव मौलाना ने पन्द्रह मास से अधिक अवधि तक सिगरेट को हाथ नहीं लगाया। किन्तु ज्योंही आप रिहा हुए, आपने सिगरेट की फर्माइश की।

मौलाना को प्रदर्शन, हंगामों और जुलूसों से बहुत नफरत है। आप भोजनार्थ किसी का बहुत ही कम निमंत्रण स्वीकार करते हैं। आप एक जादूई वक्ता हैं। आप बड़ी-बड़ी भीड़ों और सभाओं को अपनी बातों और दलीलों से कायल कर सकते हैं, लेकिन इसके बावजूद आप आम लोगों से बहुत कम घुलमिल सकते हैं। हाँ, काँग्रेस कमिटी की बहसों में आप उल्लेखनीय हिस्सा लेते हैं और आपकी बहस हमेशा महत्वपूर्ण एवं सम्मान्य बुद्धि समझी जाती है।

[सारांश—"मौलाना आजाद"—अध्याय 11]

मो० अजमल खाँ*

स्वर्गीय मौलाना का घरेलू जीवन

हदीसे सोहबते खूबानो जामो बादा बुगो,
बकौले हाफिजो फतवाए पीरे साहिबे फन ।

मालूम नहीं उस वास्तविक प्रातः को लोगों ने प्रातः मिथ्या (सुब्हे काजिब) का नाम दे रखा है जिसके सम्बन्ध में ब्रह्माण्ड का कण-कण साक्षी है कि उस समय से अच्छा कोई समय नहीं होता। प्रकृति की रंगारंगी का सच्चा चित्र अगर दृष्टिगोचर हो सकता है, सुख चैन, शान्ति, ताजगी, फुर्ती का अगर कोई मानचित्र बन सकता है तो उसका यही वक्त होता हैं। ठीक उस वक्त गर्मी हो या जाड़ा, वसंत हो या पतझड़, निद्रा से जगने पर स्वयं अपने हाथ से मौलाना सादा चाय बनाते थे और चंद सिगरेट पीने के बाद सुन्दर कहवे की प्याली में हल्के रंग की चाय पीने लगते थे। सफर में हों या घर में नौकर का कायदा था कि रात के खाने के बाद स्पिरिट के साथ चूल्हे को (सफर में) या बिजली के हीटर को घर में) ठीक ढंग से रख देना। मौलाना को यह पसंद न था कि नौकर या किसी दोस्त को प्रातः मिथ्या (सुब्हेकाजिब) की चाय के लिए तकलीफ दें। बेशक अन्तिम चंद बरसों में शारीरिक कमजोरी की मजबूरी ने यह सेवा नौकरों के सुपुर्द करा दी थी।

यह समय मौलाना के पवित्र चिन्तन-मनन का समय होता था। जिन लोगों को उस समय उनके पास बैठने का शुभ अवसर मिला है वे जानते हैं कि फिनजान (कहवा पीने की प्याली) के हल्के गुलाबी रंग और मिस्री सिगरेट के आड़े-तिरछे उड़ते धुएँ से प्रिय-कपोल का स्मरण हो जाता था या उसके

* मौलाना आजाद के निजि सहायक

साथ-साथ किसी के काले घुँघराले केश भी। या उस चाय से बातों की नदियाँ बह निकलती और "रख दे कोई अंगूरी का प्याला मेरे आगे" वाली स्थिति पैदा हो जाती थी। हर हाल में उस शान्त और एकान्त वातावरण में मौलाना के सौम्य मुख से वो फूल झड़ते थे कि "वह कहें और सुना करे कोई।"

यदि कोई पास बैठा होता था तो तीन फिनजानें जरूर पिलाते थे। इतने में समाचारपत्र प्राप्त हो जाते थे और स्नान करने के पश्चात् भी उनका अध्ययन जारी रहता था। आठ-नौ बजे के बीच पत्रों के उत्तर दिये जाते थे। यदि कोई बयान प्रेस को या सरकार को देना होता था तो उसी समय वह भी तैयार किया जाता था। लगभग आठ बजे दो उबले अंडे और एक-दो टोस्ट खाकर और दुग्धरहित काली चाय पीकर फिर काम में लग जाते थे।

मंत्रिमंडल में सम्मिलित किये जाने के पूर्व ग्यारह साढ़े ग्यारह बजे बहुत सादा खाना खा लिया करते। यदि कलकत्ता से बाहर रहना होता, उदाहरणार्थ वर्धा में काँग्रेस कार्य समिति के क्रम में, या काँग्रेस के वार्षिक अधिवेशन में, तो दोपहर के खाने के समय में मेजबान की आसानी का ख्याल रखते थे, और अगर देर होने लगती थी तो सिर्फ चाय और चंद नमकीन बिस्कुट खा लेते थे और खाना नहीं खाते थे।

कार्यालय जाने के पूर्व भी लोगों से भेंट-मुलाकात का समय निकाल लेते थे और कार्यालय में भी। ठीक दस बजकर बीस मिनट में कार्यालय के लिए रवाना हो जाते थे और वहाँ कार्यालीय या संसदीय कार्य करते रहते थे। साढ़े बारह बजे के लगभग घर पहुँचते थे और चंद मिनट बाद खाना खा लेते। सामान्यत: दोपहर के खाने में मछली के दो टुकड़े, चावल, कोरमा, दाल, तरकारी होती थी। उस समय रोटी नहीं खाते थे। रात के खाने में रोटी और चूजा (मुर्गी के बच्चे का मांस) का सालन भी खाते थे।

तीसरे पहर की चाय के साथ भरे हुए समोसे जरूर खाते थे और रात में नौ बजे खाना खा लेते थे और दस बजे तक सो जाते थे। दोपहर के खाने के बाद कुछ देर जरूर सोते थे।

खाने के मामले वह मध्यममार्गी थे, यानी न कम खाते थे और न ज्यादा। बल्कि मेरे विचार से कमी की ओर ही उनका झुकाव था। समय बेसमय खाना खा लेना उनके स्वभाव के विरूद्ध था। चटपटी और नमकीन चीजें पसंद थीं। मिठाई की ओर बिल्कुल प्रवृत्ति नहीं थी, बल्कि मेरे हलवा खाने पर उन्हें आश्चर्य होता था।

एक बार वार्धा में कोंग्रेस कार्य समिति की बैठक थी। सब का खाना सेठ जमनालाल बजाज की पत्नी से सम्बद्ध था। सेठ साहब गाय के बड़े रक्षक थे। उनका विचार था कि गोहत्या को रोकने का उत्तम उपायं यह है कि लोग केवल गाय की घी खाएँ। इसलिए उनके यहाँ गाय का शुद्ध घी मिलता था। इसके अतिरिक्त वह स्वदेशी के ऐसे समर्थक थे कि गुड़ खाना ज्यादा पसंद करते थे। और मौसमी अनाजों की रोटियाँ, उदाहरणार्थ ज्वार, बाजरा आदि भी दस्तरखान पर होता था। मराठों का प्रिय भोजन यानी नमकीन चूड़े भी जलपान में होते थे। इनमें से किसी किसी चीज को मौलाना नापसंद नहीं करते थे। एक दिन मुझसे कहने लगे कि देखा जवाहरलाल किस स्वाद से गुड़ खा रहे हैं। मौलाना को गुड़ पसंद नहीं था। मैंने कहा कि मौलाना, पंडित जी ने विलायत में शिक्षा पाई है और जो स्वाद चाकलेट में होता है वही गुड़ में होता है। इस पर वह हँसने लगे।

कदाचित् 1937 ई० या 1938 ई० की घटना है कि मौलाना पेशावर में डा० खान साहब (शहीद) के यहाँ ठहरे हुए थे। कहीं देहात से या उस्मान जई मे गुड़ आया था। खाने के बाद वह भी खाया, मगर मौलाना ने एक टुकड़ा न उठाया। मैंने दो चार टुकड़े स्वाद ले लेकर खाये। खैर, मामला गुजर गया। शाम के खाने पर पुडिंग थी, मगर गुड़ नहीं। मैंने डॉ० खान साहब से कहा कि क्या आप सब गुड़ खा गये। उन्होंने नौकर से कहा कि गुड़ हो तो दो। दो चार टुकड़े बचे-खुचे रह गये थे, सब मैंने खा लिये। मौलाना ने फरमाया आप गुड़ बहुत पसंद करते हैं। मैंने कहा—मौलाना, यह गुड़ नहीं है, यह मेवों का हलवा है। खान बन्धुओं की संपुष्टि के बावजूद मौलाना ने गुड़ को मुँह न लगाया। काश, वह खा लेते तो समझ जाते कि उसमें मुसल्लम बादाम, पिस्ते, चिलगोजे (एक फल) मिले हुए थे। मौलाना ये एकान्त में मुझसे कहा कि किसी के दस्तरखान पर फर्माइश न किया करो।

फलों में भी मौलाना को रूचि न थी। डाक्टर बार बार कहते थे कि "विटामिन बी" का खाना जरूरी है और वह फलों में होती हैं। किन्तु मौलाना इस बात पर बहुत कम ध्यान देते थे। अंतिम आयु में नारंगी का रस या किसी फल के दो चार टुकड़े अपराह्न जलपान के साथ खा लेते थे। "विटामिन बी" को चबा डालना उन्हें पसंद न था। या तो उसके स्त्रीलिंग होने के कारण, या इस विचार से कि मिठास का परिणाम कटु होता है, या यों समझिए कि दर्शन से दर्षनाभिलाषा अधिक महत्व रखती है।

यद्यपि मौलाना कह चुके थे कि खाद्य पदार्थ की दूसरे के दस्तरखान पर प्रशंसा करना अच्छा नहीं होता। मैंने फिर एक स्थान षर प्रशंसा कर दी। हुआ यह कि हम डा. रज्जब अली पटेल के यहाँ वार्डन रोड बम्बई में मेहमान थे। विभिन्न फलों की चर्चा चली। मौलाना चुप थे। डा० पटेल ने स्वास्थ्य-संबंधी लाभ बताये। मैंने चिकित्साशास्त्र से हटकर कहा कि जनाब मालूम नहीं लोग आम की क्यों प्रशंसाएँ करते हैं। मेरी राय में तो सर्वोत्तम फल अंजीर है (मालूम नहीं अंजीर को लोग स्त्रीलिंग, बोलते हैं या पुलिंग, मैं तो उसकी बेहद मिठास, स्वादिष्टता, गोलाई, लघुता और रंगीनी के कारण से स्त्रीलिंग समझता हूँ) डाक्टर साहब की बीबी श्रीमती जीना बाई (यानी जीनत बी) ने तुरंत पूना तार भेजा और शाम तक उत्तमोत्तम अंजीरें खाने के टेबुल पर मौजूद थी। मौलाना को भी दो-एक खाना पड़ा। लेकिन फिर उन्होंने एकान्त में सिखाया—फर्माइश करनी ठीक नहीं है। मगर हम कब चूकनेवाले थे। अलीगढ़ कालेज ही के जमाने में हलवाखोरी बल्कि सीनाजोरी की आदत पड़ गई। मालूम नहीं सफीउल हसन और सौलत हुसैन कहाँ हैं जो मंटो सर्किल सी ब्लॉक के बारह नम्बर के कमरे में 1914 ई० में रहते थे, और जिनका अठारह सेर नकद हलवा स्वर्गीय रफी अहमद किदवाई के साथ हम सबने चुराया था और पन्द्रह मिनट के भीतर हम सबने चट कर लिया था।

मौलाना की यह भी आदत थी कि दावत स्वीकार नहीं करते थे। यदि कोई महत्वपूर्ण राजनीतिक कारण रहा तो वह रात के खाने मे तो कदापि सम्मिलित नहीं होते थे, किन्तु दिन का खाना स्वीकार कर लेते थे और खाने में अपने स्वभाव और आदत के अनुकूल परहेज से खाते थे।

अपने घर पर हों या बाहर खाने के टेबुल पर वह इस प्रकार बात करते थे मानो सुक्तियों के फूल झड़ रहे हैं। जी चाहता था कि सुबह से शाम तक खाए चलो और मधुर उक्तियों और नमकीन अदाओं से श्रवण-स्वाद पाते रहो। कहीं यह बात आ गई कि हिन्दुस्तान के खानों में इब्नेबतूता को खिचड़ी और पापड़ बहुत पसंद थे। मैंने कहा कि इब्नेबतूता ही को नहीं बल्कि अंग्रेजों को भी पापड़ स्वादिष्ट लगता था और जब उन्होंने पहले-पहल कागज देखा तो उसे पापड़ (पेपर) कहने लगे यानी यह वही चीज है जो हिन्दुस्तान में खाई थी। कभी चीनी की चर्चा होती तो मौलाना फरमाते कि विचित्र बात है कि हिन्दुस्तान में ईख का पौधा कदाचित मिस्र या चीन से आया होगा, वर्ना क्यों मिश्री और चीनी के नाम यहाँ प्रचलित हुए; वह हरी मिर्च की बहुत तारीफ करते थे और कहते थे कि हकीम साहब (यानी स्वर्गीय हकीम अजमल खाँ साहब) का कथन है कि जो व्यक्ति हरी मिर्च खाता है उसे कभी न तो पेट की खराबी की शिकायत होती है और न पेचिश परेशान करती है।

जबसे इलाहाबाद के स्टेशन पर मौलाना एक नारंगी के छिलके पर फिसले और उनके घुटने की हड्डी टूटी, वह हमेशा टेबुल पर बैठ कर खाना खाया करते थे। वार्धा में सब फर्श पर बैठते थे, मगर मौलाना के लिए एक टेबुल-कुर्सी का प्रबंध किया जाता था। इसके अतिरिक्त वह अधिक पसंद करते थे कि छुरी-काँटे से खाना खाएँ।

वस्त्र

बचपन में मौलाना की वही खानदानी पोशाक थी जो मौलवियों और शेखों में प्रचलित थी लेकिन उनकी तबीयत में न सिर्फ नकल करने की मानसिकता से दूर रहने का रूजहान पैदा हो गया था, बल्कि ऐसा मालूम होता है कि हिन्दुस्तान के पीरों और पीरजादों के रहन-सहन से भी भिन्न मार्ग अपनाने का विचार शुरू से था। सर सैयद ने जो आन्दोलन आरम्भ किया था उसका उनके मस्तिष्क पर काफी प्रभाव था। इसके अलावा "अल-हिलाल" की प्रारम्भिक अवधि में तुर्की की ओर पूरे हिन्दुस्तान का ध्यान चला गया था। अलीगढ़ में तुर्की टोपी, तुर्की कोट और शू या बूट छात्रों

की विशेष पोशाक निश्चित हुई थी और खुद तुर्की सुल्तानों और जेनरलों की तस्वीरें हर कमरे में नजर आती थी। स्वर्गीय डा मुख्तार अहमद अन्सारी जो मेडिकल मिशन ले गये थे उनमें स्वगीय अब्दुर्रहमान सिन्धी (सिद्धीकी) भी थे जिन्होंने कलकत्ता की असह्य गर्मी में भी ऊनी तुर्की टोपी का व्यवहार न छोड़ा। शुऐब कुरैशी भी थे जो तुर्की से एक कलपाक लाये थे और उसे इस प्रकार प्रेम से रखते थे कि सन् 1913 ई० से आज तक वही टोपी उनके व्यवहार में है। बेशक चौधरी खलीकुज्जमाँ की लखनवीयत ने उनको तुर्की टोपी के बोझ से, और विशेष कर गर्मी में आजाद कर दिया है। हर हाल में सर सैयद की प्रगतिशीलता और मिल्ली कारनामे का यह प्रभाव था कि न सिर्फ "खुतबाते अहमदिया" और "साइन्टिफिक सोसाइटी" के मुद्रण ने मौलाना जैसे नवयुवक के मस्तिष्क पर प्रभाव डाला और सर सैयद की "नेचरीयत" मौलाना की पोशाक में भी प्रकट हुई। यानी उन्होंने तुर्की अर्थात् यूरोपियन पोशाक पहनना शुरू किया। उनकी एक तस्वीर "आजाद की कहानी" हाली पब्लिशिंग हाउस ने प्रकाशित की है। (देखिए पृष्ठ 186) जिसमें पगड़ी की जगह काली टोपी है। बहुत ऊँचा कड़ा कालर है। कमीज के भी कफ कड़े हैं। खुले गले का का काला तुर्की कोट हैं, सफेद पतलून है और पैर में बूट है। लेकिन हिन्दुस्तान में यह पोशाक बाद में छोड़ दी।

मौलाना जब यूरोप वगैरह गए हैं तो यूरोपियन पोशाक के कई जोड़े अपने साथ ले गए थे।

हिन्दुस्तान में उनकी आदत थी कि 1920 ई० तक वह एक हल्की पगड़ी बाँधते थे और "अबा कबा" के बदले शेरवानी का व्यवहार करते थे। कांग्रेस पार्टी में प्रवेश के पश्चात् उन्होंने खादी का व्यवहार प्रारम्भ कर दिया था। उसके प्रयोग से बहुत तकलीफ होती थी, इसलिए कि 1920 ई० की खादी में सूत के भीतर बिनौले के नुकीले टुकड़े भी कत जाते थे और बदन छील देते थे। इलाहाबाद की गर्मियों में जब मौलाना 1940 ई० में नैनी जेल में थे तो उनके बदन पर गर्मी और खादी के असर से "गर्मी दाने" निकल आए थे। मैंने बहुत कोशिश की कि खस की टट्टियों का प्रबंध कर दूँ, लेकिन यू० पी० सरकार की अनुमति तब मिली जब बरसात शुरू हो गई थी।

मौलाना की आदत थी कि जब मौलानाओं से मुलाकात करते थे तो टोपी पहन लेते थे, किन्तु जब वह अकेले होते या गैर-मौलाना के सामने नंगे सिर रहने लगे थे। 1937 ई० से 1947 ई तक यह आदत थी कि कांग्रेस कार्य समिति और साधारणतया खाने के समय भी टोपी पहने रहते थे जिसे वह टोपी ओढ़ना कहते थे। एक बार वार्धा में जवाहरलालजी ने कहा कि मौलाना इतनी गर्मी है और यह टोपी बहुत गर्म है। मौलाना ने फरमाया कि यह केवल पोशाक की पाबंदी है।

मस्तिष्क-शक्ति-वर्धक माजून

उसी जमाने की एक बात है कि मौलाना के प्रति श्रद्धा रखने वाले एक हकीम सफीउद्दीन साहब ने मस्तिष्क-शक्ति-वर्धक माजून तैयार की थी। मौलाना मोहम्मद मियाँ फारूकी (बाद में संसद-सदस्य) मेरे साथ जेलखाना गये थे। हकीम सफीउद्दीन साहब का तोहफा प्रस्तुत किया गया, तो मौलाना ने पूछा "हकीम साहब क्या समझते हैं कि मेरे मस्तिष्क का कोई कोना अंधकारमय है; वह माजून मौलाना ने ले तो लिया, लेकिन बाद में मालूम हुआ उन्होंने डा कैलाशनाथ काटजू (बाद में मध्य प्रदेश के मुख्य मंत्री) को दे दी। मालूम नहीं कि उन पर माजून का क्या प्रभाव पड़ा।

मौलाना का यह हाल था कि दवाओं के सम्बन्ध में भी वह यूरोपियन दवाओं को हिन्दुस्तानी हकीम-वैद्य की दवाओं से अधिक महत्व देते थे। किसी हिन्दुस्तानी (यानी यूनानी) दवा की लाख प्रशंसा कीजिए, लेकिन मौलाना उसको हर्गिज व्यवहार नहीं करते थे। अन्तिम चंद महीनों मे उन्होंने कलकत्ता के सुप्रसिद्ध चिकित्सक एस० के० बोस का होमियोपैथिक इलाज शुरू किया था, किन्तु किसी धारणा का इतना प्रभाव होता है कि मौलाना पर उनकी दवाओं का कोई उल्लेखनीय प्रभाव नहीं हुआ।

सिगरेट और किताब—मौलाना के जीवन की दो चीजें ऐसी थीं जिनसे वह कभी अलग नहीं हो सके, उन्हें नहीं छोड़ सके। एक चीज सिगरेट और दूसरी किताब। उन्होंने सिगरेट पीने की अधिकता इतनी कर दी थी कि एक के बाद एक सिगरेट पीते रहते थे। अगर कुछ कहना भी होता था तो

सिगरेट को दूसरे हाथ की अंगुलियों में थामे रहते थे जब तक अंगुलियाँ धुएँ के असर से रंगीन हो गई थीं।

वैसे मौलाना ने अरबी और विशेषतः फारसी की प्रायः सारी किताबें पढ़ डाली थीं। बाद में अंग्रेजी किताबों के प्रति अभिरूचि बेहद बढ़ गई थी। तोहफे के रूप में बहुत सी फारसी, अरबी और उर्दू की किताबें आती रहती थीं, लेकिन किसी पर पूरा ध्यान नहीं दे पाते थे। किताब का शीर्षक या नाम देखकर उसका विषय भाँप लेते थे और किसी-किसी किताब पर सरसरी नजर डाल देते थे। कुछ किताबों की कभी-कभी चर्चा भी कर देते थे। उनमें से चौधरी गुलाम रसूल "मेहर" की "हयाते सैयद अहमद बरेलवी" और "हालाते गदर" का दो बार इस प्रकार जिक्र किया कि जिससे मालूम हुआ कि उन्होंने पूरी किताब पढ़ डाली है। सैयद साहब के सहायकों में मेरे दादा इलाहदाद खाँ भी थे। मुझसे बार बार उनके हालात पूछे। कदाचित इसका यह कारण हो कि उन्हें सैयद साहब के पथ से सम्बद्धता की वजह से उनके नाम लेवाओं से भी प्रेम था। इस प्रकार मेरे वालिद के सम्बन्ध में पूछते रहे कि विद्रोह में उनके क्या कारनामे थे। मैंने उन्हें बताया कि जब नाना साहब की आज्ञा से अंग्रेजों की नौका कानपुर में डुबोई गई तो मेरे वालिद (स्वर्गीय मोहम्मद इस्माईल खाँ साहब) ने एक अंग्रेजिन को नदी में कूदकर निकाल लिया था। उसका नाम ईमेलिया कुक था। फिर उसे घोड़े पर सवार करके घर ले आये थे। अहमदुल्लाह शाह के हाथ पर मुसलमान कराकर "बैअत" कराया था और फिर निकाह कर लिया। फरमाया कि—

स: पुश्त से है पेशए आबा सिपहगरी।

मैंने निवेदन किया कि अब तो कांग्रेस के फरमान के अनुसार सिपहगरी की जगह तिर्छी नजरों से देखना भी ज्यादती समझते हैं। इस पर मौलाना ने किसी पुराने शायर का यह शेर पढ़ा कि—

कत्ल मत करना मुझे तेग-व-तबर से देखना,
बस किफायत है तिरा तिर्छी नजर से देखना।

दूसरी बातें—मालूम होता है लड़कपन से पीर पुत्र होने का हृदय और मस्तिष्क पर इतना प्रभाव पड़ा था कि वह जनसाधारण की संगति से दूर

ही रहना चाहते थे। खास लोगों से भी वह बहुत कम मिलना चाहते थे। उनके बच्चे होते तो शायद यह "सम्मेलन में एकान्त" और "कदम पर नजर" के नक्शबंदी सूफी सम्प्रदाय के सिद्धान्त उनके मस्तिष्क पर एकान्तप्रियता का आक्रमण न करने देते। बचपन से न बच्चों के साथ मिले और न मुरीदों द्वारा हाथ-पैर-चूमने को पसंद किया। बड़े हुए तो टहलने के लिए भी कमरे से बाहर नहीं निकले। मालूम होता था कि छाया को भी साथ रखना पसन्द नहीं करते। इसका उनके स्वास्थ्य पर बहुत बुरा प्रभाव पड़ रहा था। डाक्टरों और मित्रों के टहलने-घुमने और बाग में सैर करने के हठ को वह समय की बर्बादी समझते रहे। यहाँ तक कि वह अपने ही विचारों में डूबे रहने लगे। "हम अंजुमन (सम्मेलन) समझते हैं खिलवत (एकान्त) ही क्यों न हो" उक्ति मौलाना पर ही सच साबित होती है।

शर्म इक अदाए नाज है, अपने ही से सही,
हैं कितने बेहिजाब के हैं यों हिजाब में।

कतिपय मित्र, उदाहरणार्थ स्वर्गीय काजी मोहम्मद अब्दुल गफ्फार या चौधरी गुलाम रसूल मेहर हफ्तों मौलाना के मेहमान रहते थे, लेकिन भेंट होने का अवसर मुश्किल से ही प्राप्त होता था। मौलाना होते थे या उनके विचार या किताबों के माध्यम से दूसरों के विचार। लिखने की आदत थी, लेकिन जेलखाने के एकान्तवास में तो कुछ-न-कुछ लिख ही लेते थे। आजादी और मंत्रिमंडल के फंदे की आजादी ने सरकारी कार्य-संबंधी लेखों को तो लिखवा दिया, लेकिन मौलाना फिर कोई ऐसी रचना न कर सके जैसी "गुबारे खातिर" है, न "तर्जुमानुल कुरान" के अर्थ को कागज के पन्नों पर ला सके। भाषणों और बयानों की तो चर्चा ही क्या। मेरे बहुत हठ करने पर "सीरतुन्नबी" (नबी की जीवनी) से सम्बद्ध कुछ संकेतों का कुरान से वर्णन फरमाया था, किन्तु अपनी बीमारियों के निरन्तर आक्रमण के कारण उन्हें भी लेखनीबद्ध न कर सके। हालाँकि उनका विचार राँची प्रवास के समय से ही यह था कि खुद कुरान से रसूल करीम की एक अच्छी खासी जीवनी तैयार हो सकती है। अहमदनगर फोर्ट जेल में स्वर्गीय आसफ अली ने यह ख्याल मौलाना के मन में पैदा किया था कि इस्लाम पर अंग्रजी में एक छोटी-सी पत्रिका तैयार की जाएगी जिसका नाम बेसिक इस्लाम (Basic Islam) होगा। जेल से मुक्ति के बाद मेरे और स्वर्गीय आसफ अली द्वारा स्मरण दिलाने के बावजूद यह भी सम्पादित न हो सका।

उन्होंने "तर्जुमानुल-कुरान" की दूसरी जिल्द पर बहुत-से हाशिये छोड़े हैं। आशा है, यदि उसके छपने का अवसर आया तो कतिपय और तथ्य सामने आएँगे। इसी प्रकार वह लिखने से पहले बहुत से शेर इकट्ठा कर लेते थे और उन्हें लेख में इस तरह समोते थे कि शायर सुनता हो स्वंय चकित हो जाता कि शेर किस प्रकार बुलंद, सुन्दर और सरल हो गया है। उनकी आदत थी कि लेख में संक्षिप्तता उत्पन्न करने के लिए लिखते थे और दुहराने से पहले ही काटते जाते थे। शब्दों और विचारों को तौलते थे और सूक्ष्मदर्शी कलाकार की भाँति उन्हें समुचित स्थानों पर जड़ देते थे।

ख्वाजा गुलामुस्सैयदैन*

मौलाना अबुल कलाम आजाद

एक रौशन दिमाग था न रहा,
मुल्क में इक चिराग था न रहा।

मौलाना आजाद का जिक्र किन शब्दों में करूँ और भावनाओं के आक्रमण को किस प्रकार मस्तिष्क के नियंत्रण में कर दूँ। उनकी महत्ता का सही अंदाजा तो उस समय लगेगा जब समय इतिहास की कठोरतम कसौटी पर समकालीन विख्यात व्यक्तियों और उनके कारनामों को परखेगा। हमलोग जो पहाड़ के आंचल में अपना जीवन व्यतीत करते रहे हैं, क्या अंदाजा कर सकते हैं उसकी बुलंदी का, उसकी बर्फ से ढकी हुई चोटियों का, जिनपर शान्ति की शाश्वत अवस्था छाई मालूम होती है, उसके हृदय के विप्लवों का, जिसमें लावा खौलता रहता है, उन तूफानों के आक्रमण, झोंको और बिजलियों की तड़प का जो उसकी गोद में पलती हैं, या जवाहरों के उन खजानों का जो उसके सीने में छिपे हैं। इस लघु निबन्ध में तो बस इतना ही कर सकता हूँ कि उस काल-जयी व्यक्तित्व के कतिपय सुव्यक्त पहलुओं की ओर संकेत कर दूँ।

हर बड़ी संस्कृति सदियों समय की गोद में पलकर अपनी पूर्णता को पहुँचती है अपने विशेष मूल्यों को विशेष सिद्धान्तों और गुण तथा अवगुण के विशेष साँचे में ढालती है। भारत की संस्कृति बहुत सी विभिन्न संस्कृतियों का संगम है, जिसके बनाने संवारने में, विभिन्न जातियों, नस्लों, भाषाओं और धर्मों ने हिस्सा लिया है। और उसका अटूट क्रम सहस्त्रों वर्ष से कायम है। प्रकृति की उदारता से इतिहास में कभी-कभी ऐसा भी होता है कि एक संस्कृति के सभी या बहुत से अच्छे मूल्य किसी असाधारण व्यक्तित्व में

---

*मौलाना आजाद के शिक्षा सचिव

अपना घोंसला खोज लेते हैं, जैसे इटली में लियोनार्डो डी विंची, जर्मनी में गेटे, अमेरिका में अब्राहम लिंकन। भारत में टैगोर, गाँधी और मौलाना आजाद इस हिन्दु-मुस्लिम संस्कृति का एक शाहकार थे जो गत सहस्र वर्ष में पूर्णता को पहुँची है। उन्होंने पूर्वी संस्कृति, साहित्य, विद्याओं और कलाओं के वातावरण में प्रशिक्षण प्राप्त किया। धर्म को अपने आकर्षण का विशेष केन्द्र बनाया और इस प्रकार उसके सर्वोत्तम मूल्यों को अपने व्यक्तित्व में समेट लिया। किन्तु वे इतने पर ही संतुष्ट नहीं हुए। उनके उदार हृदय ने इसके साथ-साथ पाश्चात्य संस्कृति के सर्वोत्तम मूल्यों को भी इस प्रकार अपनाया कि उनका व्यक्तित्व पूर्व और पश्चिम का सुन्दर संगम बन गया। इसमें एक ओर पूर्व की शान्तिप्रियता और गहनता, कल्याणप्रियता, सौंदर्य, मानवता और आध्यात्मिक अन्तर्दृष्टि थी और दूसरी ओर पश्चिम की प्रगतिशीलता, मानसिक साहसिकता, बन्धुत्वभावना, क्रियात्मकता और जनसाधरण की तरफदारी की भावना काम कर रही थी। इस प्रकार उनका व्यक्तित्व भूत और वर्तमान के बीच, पूर्व और पश्चिम के बीच पुल का काम करता था। मौलाना आजाद "दीन" के उद्भट विद्वान थे, किन्तु मुल्ला की संकीर्ण दृष्टि से मुक्त। दर्शन में गहन दृष्टि थी, किन्तु कभी इसकी सतही टीका-टिप्पणियों में मार्ग से नहीं भटके। उनका मजहब मार्ग गोया यह था—

न फलसफी से न मुल्ला से है गरज मुझको।
ये दिल की मौत, वो अदेशा व नजर का फसाद।

उनके पास धर्म, दर्शन, विज्ञान, राजनीति सबका एक ही उद्देश्य था और वह यह कि मनुष्य अपने जीवन को भद्रता के साँचे में ढाले और इस उद्देश्य के लिए अपनी शारीरिक, मानसिक और आध्यात्मिक शक्तियों को पूर्णरूपेण विकसित करे। उनके जीवन में दीन और दुनिया का फर्क न था, दोनों में सत्यप्रियता और भद्रता के सिद्धान्तों का पालन था। वह एक परिपक्व और जाग्रत मस्तिष्क युक्त राजनीतिज्ञ थे किन्तु वह उन तमाम कूटनीतियों और घटिया चालों से ऊपर थे जिनके द्वारा बहुत से राजनीति का खेल खेलनेवाले अपनी शक्ति और प्रभाव की वृद्धि की कोशिश करते हैं। उन्होंने अपनी कौम और देश के दिल में अपनी जगह पैदा की थी, लेकिन इसके लिए कभी विज्ञापनबाजी के तरीकों से काम नहीं लिया। वह कभी

अवाम की सतह पर नहीं उतरे, बल्कि साहस और समझदारी के साथ उन्हें ऊपर उठाकर अपनी सतह पर लाने की कोशिश की और जब कभी वे रास्ते से भटके और मौलाना की ओर से उन्होंने अविश्वास और विमुखता व्यक्त की, मौलाना सेरातेमुस्तकीम (सीधे मार्ग) पर अग्रसर रहे । राजनीति के तूफान आये, भूकम्पों ने पहाड़ों के स्थिर कदम को लड़खड़ाया, लेकिन यह खुदा का बहादुर बंदा, गौरव-गिरि मोमिन अपने स्थान पर, अपने सिद्धान्तों पर, अपनी राय पर दृढ़ता के साथ कायम रहा इस शान के साथ कि "न सिताइश की तमन्ना न सिले की परवा" (न प्रशंसा की इच्छा और न दंड की परवाह), न विरोधियों और अपशब्द वाचकों की निन्दा न भय । उनकी मुँह फट कटोक्तियों और बदजबानी का इस तरह बर्दाश्त किया कि ललाट पर बल तक न आया । अधिक से अधिक कहा तो इतना कहा "ये कैसे आकिबत नाशनास (परिणाम से अपरिचित) हैं ।" यानी नहीं जानते, नहीं समझते कि इनके क्रियाशीलन का क्या नतीजा होने वाला है । उनके दिल में द्वेष के लिए जगह ही न थी । उन्होंने किसी जगह जहूरी का एक शेर नकल किया है जो उनके साफ हृदय का भी नक्शा भी खींचता है—

शुदस्तं सीनः जहूरी पुरअज मुहब्बते यार,
बराए कीनए अगियार दर दिलम जा नीस्त ।

कौम के लिए उनका संदेश यही था कि भलाई और भद्रता का साथ दो और बुराई तथा अन्याय के साथ संबंध न जोड़ो । खुदा की रस्सी को जो हक और सच्चाई की रस्सी है, सत्य का मार्ग है, दृढ़ता के साथ पकड़ो । खुद उन्होंने उम्र भर कभी इस ठोस विवेक, इस मजबूत रस्सी को नहीं छोड़ा । कभी गलती और अन्याय में "अपनों" का साथ नहीं दिया । कभी सही और सच्ची बात में "गैरों" से विमुख नहीं हुए उनके लिए "अपने" वही थे जो उनके सिद्धान्तों से सहमत हों और "गैर" वह जो उन सिद्धान्तों का विरोध करें ।

कुदरत ने उन्हें ऐसा उज्ज्वल मस्तिष्क दिया था कि वह हर मुश्किल राजनीतिक समस्या की गुत्थियों को सुलझा देते थे । उनकी तदबीर की तीक्ष्णता मार्ग की रूकावट को छेदकर सफलता का रास्ता खोल देती थी । यही बात कार्यालय के कामों में थी । हमलोग मामले के विश्लेषण में उलझते, अनुकूल और प्रतिकूल दलीलों का फरेब खाते, लेकिन उनकी दृष्टि विश्लेषण को भेदती हुई असल मामले तक पहुँच जाती और वह एक स्पष्ट और ठोस

निर्णय कर देते। उनका हृदय इतना विशाल था कि उसमें किसी प्रकार के पक्षपात या संकीर्णता को स्थान प्राप्त न था। उनके सारे काम न्यायप्रियता और इन्सान दोस्ती से भरपुर थे। इसी कारण से उनपर सभी अल्पसंख्यकों को पूरा-पूरा भरोसा था और वे जानते थे कि मौलाना उनके जायज हकों का समर्थन करेंगे। मैंने उनकी जबान से किसी व्यक्ति की बुराई में सख्त से सख्त शब्द यह सुना कि अमुक "छोटे दिल और दिमाग का आदमी है"। यानी उनकी तराजू में दिल और दिमाग की संकीर्णता इन्सान की सबसे बड़ी वंचना और अपमान था।

उन्होंने स्वाधीनता-संग्राम के जमाने में उस आन्दोलन का नेतृत्व किया और कारावास की मुसीबतों और कुर्बानी तथा त्याग की परीक्षाओं को मधु का घूँट बनाकर पीया। लेकिन जब आजादी प्राप्त हुई तो उन्होंने अपनी सारी शक्ति और ध्यान इस बात पर लगा दिया कि राष्ट्रीय जीवन उत्तम बुनियादों पर कायम हो। जब कभी कोई ऐसा नाजुक अवसर या कठिन पड़ाव आया जहाँ यह शंका हो कि शायद स्वार्थ का आकर्षण, न्याय और सच्चाई को दबा दे सकता है तो उनकी सिद्धान्तप्रियता, साहस और सत्य-कथन ने दृढ़ता का सबूत दिया और स्वार्थ-पूजन को पस्त कर दिया। इसी कारण से सत्य की पहचाननेवालों ने उनको "राष्ट्र-हृदय" का खिताब दिया था। यानी इस मैदान में उन्होंने उस कर्त्तव्य के भार को उठाया था जो गाँधीजी वहन करते थे। अनभिज्ञ लोग उनको आम जलसों या सरकारी आयोजनों में और दावतों में न देखते तो ख्याल करते कि शायद मौलाना आजाद अब राजनीति के केन्द्र से दूर हो गये हैं। लेकिन उन्हें यह मालूम नहीं कि हर देश स्थान और काल के अपने शिष्टाचार होते हैं। जब कांग्रेस स्वाधीनता की लड़ाई लड़ रही थी मौलाना आजाद उसके एक महान् सदस्य और अध्यक्ष के रूप में तूफान के केन्द्र में रहे। आजादी के बाद उन्होंने अपने लिए कार्रवाई का एक दूसरा प्रशस्त पथ चुन लिया था जिसपर चलकर वह देश की सेवा और नेतृत्व कर सकते थे। बेशक अब वह एक विचार से एकान्तवासी थे। लोगों से कम मिलते-जुलते थे, लेकिन उनकी अंगुलियाँ राष्ट्र की नब्ज पर थीं और वे जानते थे कि क्या करना है और क्या करना चाहिए। उस जमाने में उनकी शान यह थी—

मिस्ले खुरशीदे सहर फिक्र की ताबानी में,
शमए-महफिल की तरह सबसे जुदा सब का रफीक।

और सबकी दोस्ती का सबूत यह है कि जब उनके बनाने वाले ने उनको याद किया और वह उस सृष्टिकर्ता का नाम लेत-लेते उसके समक्ष पहुँच गये, तो न सिर्फ लाखों दिल्ली वालों की, बल्कि करोड़ों हिन्दुस्तानियों की श्रद्धा और प्रेम, धैर्य और नियंत्रण के बन्धन को तोड़ कर उमड़ पड़ी और पारस्परिक मतभेदों और विरोधों को भूलकर सबने उनकी मौन और निःस्वार्थ सेवा को स्वीकार किया। मैंने उस अपार भीड़ में, जो 22 फरवरी को उनके मकान के गिर्द जमा था, एक बूढ़े सिख को यह कहते सुना कि "अरे तुम्हें क्या मालूम है आजाद ने तो बादशाहत की है बादशाहत"। एक अर्थ में यह बिल्कुल सत्य है। वह दिल और दिमाग के बादशाह भी थे और हुकूमत की नीति निश्चित करने और ढालने में उनका जो हिस्सा था और उनके साथी उनकी राय और निर्णयों का जो आदर करते थे उस दृष्टिकोण से उस बूढ़े का यह कथन ठीक मालुम होता है।

लेकिन यह बादशाह जिसमें एक तरफ अत्यधिक खुद्दारी और अहं की अनुभूति थी जो कभी किसी शक्ति के सामने सर न झुकाता था, वह एक फकीर भी था। फकीर इकबाल की परिभाषा में, यानी —

दारा व सिकन्दर से वह मर्दे फकीर औला,
हो जिसकी फकीरी में बूए असदुल्लाही।

इसी कारण से उसके यहाँ फकीरी और शाही के डांडे मिल जाते थे और दिल पुकार उठता था—

न तख्त व ताज में, नै लश्कर व सिपाह में है,
जो बात मर्दे कलन्दर की बारगाह में है।

इस फकीर के पास सांसारिक सामान बहुत कम थे, न माल, न दौलत, न जायदाद, न पूँजी। न निजी जीवन के वे बन्धन जो दिल में कमजोरी पैदा करते हैं। उनमें बेपरवाही की एक विशेष शान थी, नाम और शेखी तथा ख्याति प्रियता से घृणा थी। कभी किसी संस्था, किसी शिक्षालय, किसी अन्य भवन को अपने नाम से सम्बद्ध नहीं होने दिया। शायद एक बार के अतिरिक्त किसी विश्वविद्यालय की मानदेय उपाधि स्वीकार नहीं की। अपनी जन्म-तिथि तक गुप्त रखी कि कहीं दोस्त और श्रद्धालु उसको मनाने न लगें।

मौलाना आजाद ने जहाँ एक शाहाना व्यक्तित्व और चिन्तन प्रणाली तथा व्यवहार पाया था वहाँ उनके दिल में आम लोगों, गरीबों और समाज के सताये हुए वर्गों के लिए विशेष सहानुभूति और स्नेह था जिसकी कहानियाँ लोगों की जबान मुद्तों तक सुनाएगी। लेकिन उसकी एक अनोखी झलक आपकी उस "समर्पण" में दिखाई देगी जो उन्होंने 1931 ई० में अपने विद्वतापूर्ण और धार्मिक ग्रंथ "तर्जुमानुल कुरान" के लिए लिखा था। उस जबदस्त रचना को उन्होंने न किसी रईस के नाम समर्पित किया, न विद्वान के, न किसी मित्र के, न किसी प्रिय व्यक्ति के, बल्कि एक गरीब अज्ञात अजनबी के नाम जो उनके पास एक दूसरे देश से सैकड़ों मील पैदल चलकर ज्ञान और धार्मिक मार्गदर्शन हासिल करने आया था।

× × ×

"कदाचित सितम्बर, 1918 ई० की घटना है, मैं राँची में नजरबन्द था, एशा (रात) की नमाज पढ़कर मस्जिद से निकला तो मुझे महसूस हुआ कि कोई आदमी पीछे आ रहा है। मुड़कर देखा तो एक व्यक्ति कम्बल ओढ़े खड़ा था।

"आप मुझसे कुछ कहना चाहते हैं ?"
"हाँ जनाब, मैं बहुत दूर से आया हूँ"
"कहाँ से ?"
"सरहद पार से"
"यहाँ कब पहुँचे ?"

"आज शाम को पहुँचा। मैं बहुत गरीब आदमी हूँ। कंधार से पैदल चलकर क्वेटा पहुँचा। वहाँ मुझे मेरे देश के कुछ व्यापारी मिल गये थे, उन्होंने नौकर रख लिया और आगरे पहुँचा दिया। आगरे से यहाँ तक पैदल चलकर आया हूँ"।

"अफसोस, तुमने इतने कष्ट क्यों झेले ?"

"इसलिए कि आपसे कुरान मजीद के कुछ स्थलों को समझ लूँ। मैंने "अल-हिलाल" और "अल-बलाग" का एक-एक अक्षर पढ़ा है।"

यह व्यक्ति चंद दिनों तक ठहरा और एकाएक चला गया। चलते समय वह इसलिए नहीं मिला कि उसे संदेह था मैं उसे वापसी के खर्च के लिए रूपये दूँगा, और वह नहीं चाहता था कि इसका भार मुझपर डाले। उसने वापसी में भी निश्चय ही यात्रा का बड़ा भाग पैदल ही तै किया होगा।

"मुझे उसका नाम याद नहीं है। यह भी नहीं मालूम कि वह जीवित है या नहीं। किन्तु यदि मेरी स्मरणशक्ति कमजोर न होती तो मैं किताब उसी के नाम से समर्पित करता।"

× × ×

कैसी शानदार और प्रभावशाली स्वीकृति है, सच्ची आस्था की, ज्ञान की प्यास की, धर्म की सच्ची लगन की, चाहे वह पुराना कम्बल ही क्यों न ओढ़े हो।

उस मोमिन पुरूष के जीवन में खुदा की उदारता की एक अजीब शान नजर आती है। उसे प्रकृति ने क्या कुछ नहीं दिया, प्रकटत: सुन्दर रूप जो उसको लाखों में विशिष्ट बनाती थी, मस्तिष्क की प्रतिभा जो चिन्तन-मनन और कर्म के तमाच्छादित कोनों को प्रकाशित करती थीं, हृदय का विस्तार या महानता जिसमें पक्षपात के अतिरिक्त सबके लिए स्थान था, विद्या-ज्ञान का वह फैलाव जिसकी सीमाओं का पता न चले। लेखन और भाषण का वह कमाल जो उसकी जिन्दगी ही में कहानी बन गया। भाषा को उसने एक नई प्रकृति और नयी शैली प्रदान की और शब्दों से काम लिया शोला और शबनम का, युद्ध और गोष्ठी का, फूल और तलवार का। मजहब में उसकी वह नजर थी कि उसके आईने में दीन और दुनिया दोनों की स्पष्ट तस्वीर दृष्टिगोचर होती थी, और वर्तमान चिन्तन धारा की ऐसी जानकारी कि पश्चिम के विद्वान भी उसका लोहा मानते थे—यह थे मौलाना आजाद।

***